اردو لائبریری

بادشاہت کا خاتمہ

سعادت حسن منٹو

مکتبہ اردو لاہور

بادشاہت کا خاتمہ

بادشاہت کا خاتمہ

سعادت حسن منٹو

مکتبہ اردو — پوسٹ بکس نمبر ۹۵۳ — لاہور

بانی

مکتبہ اُردو

چوہدری برکت علی (مرحوم)

باردوئم	نومبر ۴۷ء
تعداد	ایک ہزار
ناشر	چوہدری محمد اکبر
پریس	اشرف پریس لاہور
قیمت	روپے
کتابت	محمد سعید کمال

مکتبہ اردو — پوسٹ بکس نمبر ۹۵۳ — لاہور

ترتیب

برج موہن کے نام

مکتبہ اُردو

رجسٹرڈ

سنہ ۱۹۳۵ء

پیش لفظ

مجھے ان افسانوں کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ یہ میرے افسانے ہیں ان کی خوبی علاوہ اس کے کہ یہ میرے ہیں یہ ہے کہ یہ بہت مختصر عرصے میں سپردِ قلم ہوئے ہیں جن حالات میں یہ لکھے گئے اس کا حال میں جانتا ہوں یا میرا خدا جو بڑا بے نیاز ہے۔

ہر افسانے کے اختتام پر ایک تاریخ درج ہے جو بتاتی ہے کہ افسانہ کب لکھا گیا۔ ان تاریخوں سے آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ میں نے یہ مجموعہ مجموعی طور پر کتنے عرصے میں تیار کیا۔ صاحبِ نظر قارئین اس تاریخی مجموعے سے میرے ذہن کے متعلق ایک خاص عرصے کی حد تک اپنے اپنے خیال کے مطابق رائے ضرور قائم کر سکیں گے۔

ان افسانوں میں ایک خوبی یا بُرائی یہ بھی ہے کہ ان کی طوالت قریب قریب یکساں ہے۔ یہ میں نے افسانہ نگاری میں ایک نیا تجربہ کیا ہے اس کے متعلق میں ناقدینِ فن کی رائے بڑی دلچسپی سے پڑھوں اور سنوں گا۔

اور کچھ کہنا نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ پاکستان میں ابھی تک زندہ ہوں

سعادت حسن منٹو

۱۴ر جون ۱۹۵۰ء

بادشاہت کا خاتمہ

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ من موہن پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا۔

"ہیلو ——— فور فور فور فائیو سیون۔"

دوسری طرف سے پتلی سی نسوانی آواز آئی۔ "سوری — رونگ نمبر۔"

من موہن نے ریسیور رکھ دیا اور کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

یہ کتاب وہ تقریباً بیس مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی خاص بات تھی۔ دفتر میں جو ویران پڑا تھا۔ ایک صرف یہی کتاب تھی جس کے

آخری اوراق کرم خوردہ تھے

ایک ہفتے سے دفتر من موہن کی تحویل میں تھا۔ کیونکہ اس کا مالک جو کہ اس کا دوست تھا۔ کچھ روپیہ قرض لینے کے لئے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ من موہن کے پاس چونکہ رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لئے فٹ پاتھ سے عارضی طور پر وہ اس دفتر میں منتقل ہو گیا تھا اور اس ایک ہفتے میں وہ دفتر کی اکلوتی کتاب تقریباً بیس مرتبہ پڑھ چکا تھا۔

دفتر میں وہ اکیلا پڑا رہتا۔ نوکری سے اسے نفرت تھی، اگر وہ چاہتا تو کسی بھی فلم کمپنی میں بطور فلم ڈائریکٹر کے ملازم ہو سکتا تھا۔ مگر وہ غلامی نہیں چاہتا تھا نہایت ہی بے ضرر اور مخلص آدمی تھا۔ اس لئے دوست یار اس کے روزانہ اخراجات کا بندوبست کر دیتے تھے۔ یہ اخراجات بہت ہی کم تھے۔ صبح کو چائے کی پیالی اور دو توس۔ دوپہر کو دو پھلکے اور تھوڑا سا سالن سارے دن میں ایک پیکٹ سگریٹ اور بس!

من موہن کا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہیں تھا۔ بے حد خاموشی پسند تھا۔ جفاکش تھا۔ کئی کئی دن فاقے سے رہ سکتا تھا۔ اس کے متعلق اس کے دوست اور تو کچھ نہیں لیکن اتنا جانتے تھے کہ وہ بچپن ہی سے گھر چھوڑ چھاڑ کے نکل آیا تھا۔ اور ایک مدت سے بمبئی کے فٹ پاتھوں پر آباد تھا۔ زندگی میں صرف اس کو ایک چیز کی حسرت تھی۔ عورت کی محبت کی۔ وہ کہا کرتا تھا۔ اگر مجھے کسی عورت

کی محبت مل گئی تو میری ساری زندگی بدل جائے گی۔"

دوست اس سے کہتے "تم کام پھر بھی نہ کرو گے۔"

من موہن آہ بھر کر جواب دیتا۔ "کام ؟ ——— میں مجسّم کام بن جاؤنگا"

دوست اس سے کہتے۔ "تو شروع کردو کسی سے عشق۔"

من موہن جواب دیتا۔ "نہیں ——— میں ایسے عشق کا قائل نہیں۔

جو مرد کی طرف سے شروع ہو۔"

دوپہر کے کھانے کا وقت قریب آرہا تھا من موہن نے سامنے دیوار پر کلاک کی طرف دیکھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا۔ "ہیلو ——— فور فور فائیو سیون۔"

دوسری طرف سے پتلی سی آواز آئی۔ "فور فور فائیو سیون ؟"

من موہن نے جواب دیا "جی ہاں !"

نسوانی آواز نے پوچھا "آپ کون ہیں ؟"

"میں من موہن" ! ۔ فرمایئے !

دوسری طرف سے آواز نہ آئی تو من موہن نے کہا۔ "فرمایئے کس سے بات کرنا چاہتی ہیں آپ ؟"

آواز نے جواب دیا "آپ سے !"

من موہن نے جواب میں ذرا حیرت سے پوچھا "مجھ سے ؟"

"جی ہاں —— آپ سے کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے۔"

من موہن ہڑبڑا سا گیا "جی! —— جی نہیں!"

آواز مسکرائی "آپ نے اپنا نام مدن موہن بتایا تھا۔"

"جی نہیں —— من موہن۔"

"من موہن۔"

چند لمحات خاموشی میں گزر گئے تو من موہن نے کہا "آپ باتیں کرنا چاہتی تھیں مجھ سے؟"

آواز آئی "جی ہاں!"

"تو کیجئے!"

تھوڑے وقفے کے بعد آواز آئی "سمجھ میں نہیں آتا، کیا بات کروں۔ آپ ہی شروع کیجئے نا کوئی بات۔"

"بہت بہتر" یہ کہہ کر من موہن نے تھوڑی دیر سوچا "نام اپنا بتا چکا ہوں، عارضی طور پر ٹھکانا میرا یہ دفتر ہے۔ پہلے فٹ پاتھ پر سوتا تھا، اب ایک ہفتہ سے اس دفتر کے بڑے میز پر سوتا ہوں۔"

آواز مسکرائی "فٹ پاتھ پر آپ مسہری لگا کر سوتے تھے!"

من موہن ہنسا "اس سے پہلے کہ میں آپ سے مزید گفتگو کروں۔ میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ فٹ پاتھوں پر

سو تے مجھے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ یہ دفتر تقریباً ایک ہفتے سے میرے قبضے میں ہے، آجکل عیش کر رہا ہوں۔"

آواز مسکرائی "کیسے عیش؟"

من موہن نے جواب دیا "ایک کتاب مل گئی تھی یہاں سے۔ آخری اوراق گم ہیں لیکن میں اسے بیس مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ سالم کتاب کبھی ہاتھ لگی تو معلوم ہو گا ہیرو، ہیروئن کے عشق کا انجام کیا ہوا؟"

آواز ہنسی "آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔"

من موہن نے تکلف سے کہا "آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

آواز نے تھوڑے توقف کے بعد پوچھا "آپ کا شغل کیا ہے؟"

"شغل؟"

"میرا مطلب ہے آپ کرتے کیا ہیں؟"

"کیا کرتا ہوں؟ ——— کچھ بھی نہیں، ایک بیکار انسان کیا کر سکتا ہے، سارا دن آوارہ گردی کرتا ہوں، رات کو سو جاتا ہوں۔"

آواز نے پوچھا "یہ زندگی آپ کو اچھی لگتی ہے۔"

من موہن سوچنے لگا "ٹھہریئے ——— بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اس پر کبھی غور ہی نہیں کیا، اب آپ نے پوچھا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ زندگی تمہیں اچھی لگتی ہے یا نہیں؟"

"کوئی جواب ملا؟"

تھوڑے وقفے کے بعد من موہن نے جواب دیا "جی نہیں —— لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی زندگی مجھے اچھی لگتی ہی ہو گی۔ جب کہ ایک عرصے سے بسر کر رہا ہوں۔"

آواز ہنسی۔ من موہن نے کہا "آپ کی ہنسی بڑی مترنم ہے۔"

آواز شرما گئی۔ "شکریہ!" اور سلسلہ گفتگو منقطع کر دیا۔

من موہن تھوڑی دیر ریسیور ہاتھ میں لئے کھڑا رہا۔ پھر مسکرا کر اسے رکھدیا اور دفتر بند کر کے چلا گیا۔

دوسرے روز صبح آٹھ بجے جب کہ من موہن دفتر کے بڑے میز پر سو رہا تھا ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ جمایاں لیتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا "ہیلو فور فور فائیو سیون۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "آداب عرض من موہن صاحب!"

"آداب عرض!" من موہن ایک دم چونکا "اوہ آپ —— آداب عرض! تسلیمات!"

آواز آئی۔ "آپ غالباً سو رہے تھے؟"

"جی ہاں —— یہاں آکر میری عادات کچھ بگڑ رہی ہیں۔ واپس فٹ پاتھ پر گیا تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔"

آواز مسکرائی "کیوں"

"وہاں صبح پانچ بجے سے پہلے پہلے اٹھنا پڑتا ہے۔"

آواز ہنسی، من موہن نے پوچھا "کل آپ نے ایک دم ٹیلیفون بند کر دیا۔"

آواز شرمائی "آپ نے میری ہنسی کی تعریف کیوں کی تھی۔"

من موہن نے کہا "لو صاحب، یہ بھی عجیب بات کہی آپ نے — کوئی چیز خوبصورت ہو تو اسکی تعریف نہیں کرنی چاہیئے؟"

"بالکل نہیں!"

"یہ شرط آپ مجھ پر عائد نہیں کرسکتیں —— میں نے آجتک کوئی شرط اپنے اوپر عائد نہیں ہونے دی۔ آپ ہنسیں گی تو میں ضرور تعریف کرونگا"

"میں ٹیلیفون بند کر دوں گی۔"

"بڑے شوق سے۔"

"آپ کو میری ناراضگی کا کوئی خیال نہیں۔"

"میں سب سے پہلے اپنے آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا —— اگر میں آپ کی ہنسی کی تعریف نہ کروں تو میرا ذوق مجھ سے ناراض ہو جائے گا —— یہ ذوق مجھے بہت عزیز ہے!"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی۔

"معاف کیجئے، میں ملازمہ سے کچھ کہہ رہی تھی —— آپ کا ذوق آپ

کو بہت عزیز ہے۔ ... ہاں یہ تو بتایئے آپ کو شوق کس چیز کا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یعنی ـــــ کوئی شغل ـــــ کوئی کام ـــــ میرا مطلب ہے آپ کو آتا کیا ہے؟"

من موہن ہنسا۔"کوئی کام نہیں آتا ـــــ فوٹو گرافی کا تھوڑا سا شوق ہے۔"

"بہت اچھا شوق ہے۔"

"اس کی اچھائی یا برائی کا میں نے کبھی نہیں سوچا۔"

آواز نے پوچھا۔"کیمرہ تو آپ کے پاس بہت اچھا ہوگا؟"

من موہن ہنسا۔"میرے پاس اپنا کوئی کیمرہ نہیں۔ دوستوں سے مانگ کر شوق پورا کر لیتا ہوں۔ اگر میں نے کبھی کچھ کمایا تو ایک کیمرہ میری نظر میں ہے وہ خریدوں گا۔"

آواز نے پوچھا۔"کون سا کیمرہ؟"

من موہن نے جواب دیا۔"ایگزکٹا۔ ریفلکس کیمرہ ہے، مجھے بہت پسند ہے۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد آواز آئی۔"میں کچھ سوچ رہی تھی۔"

"کیا؟"

"آپ نے میرا نام پوچھا، نہ ٹیلی فون نمبر دریافت کیا۔"

"مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

"کیوں؟"

"نام آپ کا کچھ ہی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کو میرا نمبر معلوم ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ آپ اگر چاہیں گی کہ میں آپ کو ٹیلی فون کروں تو نام اور نمبر بتا دیجئے گا۔"

"میں نہیں بتاؤں گی۔"

"لو صاحب یہ بھی خوب رہا۔ میں جب آپ سے پوچھوں گا ہی نہیں تو بتانے بتانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔"

آواز مسکرائی۔ "آپ عجیب و غریب آدمی ہیں۔"

من موہن مسکرایا۔ "جی ہاں کچھ ایسا ہی آدمی ہوں۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ "آپ پھر سوچنے لگیں۔"

"جی ہاں، کوئی اور بات اس وقت سوجھ نہیں رہی تھی۔"

"تو ٹیلی فون بند کر دیجئے۔ پھر سہی۔"

آواز کسی قدر تیکھی ہو گئی۔ "آپ بہت روکھے آدمی ہیں۔ ٹیلیفون بند کر دیجئے لیجئے میں بند کرتی ہوں۔"

من موہن نے ریسیور رکھ دیا اور مسکرانے لگا۔

آدھے گھنٹے کے بعد جب من موہن منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہن کر باہر نکلنے کیلئے تیار ہوا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کہا۔ فور فور فائیو سیون !"

آواز آئی "مسٹر من موہن ؟"

من موہن نے جواب دیا "جی ہاں من موہن ارشاد ؟"

آواز مسکرائی "ارشاد یہ ہے کہ میری ناراضگی دور ہوگئی ہے۔"

من موہن نے بڑی شگفتگی سے کہا "مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔"

"ناشتہ کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آپ کے ساتھ بگاڑنی نہیں چاہیئے ہاں آپ نے ناشتہ کر لیا۔

"جی نہیں باہر نکلنے ہی والا تھا کہ آپ نے ٹیلیفون کیا۔"

"اوہ ــ تو آپ جائیے۔"

"جی نہیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں، میرے پاس آج پیسے نہیں ہیں، اسلئے میرا خیال ہے کہ آج ناشتہ نہیں ہوگا۔"

"آپ کی باتیں سنکر ــ آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں ــ میرا مطلب ہے ایسی باتیں آپ اس لئے کرتے ہیں کہ آپ کو دکھ ہوتا ہے ؟"

من موہن نے ایک لمحہ سوچا، جی نہیں ــ میرا اگر کوئی دکھ درد ہے تو میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔"

آواز نے پوچھا "میں کچھ روپے آپ کو بھیج دوں ؟"

من موہن نے جواب دیا۔ "بھیج دیجئے میرے فنانسروں میں ایک آپ کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔"

"نہیں نہیں، بھیجوں گی۔"

"آپ کی مرضی!"

"میں ٹیلی فون بند کرتی ہوں۔"

"بہتر۔"

من موہن نے ریسیور رکھ دیا اور مسکراتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔ رات کو دس بجے کے قریب واپس آیا اور کپڑے بدل کر میز پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ یہ کون ہے۔ جو اسے فون کرتی ہے آواز سے صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ جوان ہے۔ ہنسی بہت ہی مترنم تھی۔ گفتگو سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہے بہت دیر تک وہ اس کے متعلق سوچتا رہا۔ ادھر کلاک نے گیارہ بجائے ادھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ من موہن نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو"

دوسری طرف سے وہی آواز آئی۔ "مسٹر من موہن۔"

"جی ہاں ۔ من موہن ۔ ارشاد۔"

"ارشاد یہ ہے کہ میں نے آج دن میں کئی مرتبہ رنگ کیا، آپ کہاں غائب تھے؟"

"صاحب بیکار ہوں لیکن پھر بھی کام پر جاتا ہوں۔"

"کس کام پر۔"

"آوارہ گردی۔"

"واپس کب آئے؟"

"دس بجے۔"

اب کیا کر رہے تھے؟"

"میز پر لیٹا آپ کی آواز سے آپ کی تصویر بنا رہا تھا۔"

"بنی؟"

"جی نہیں"!

"بنانے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں بڑی بدصورت ہوں۔"

"معاف کیجئے گا۔ اگر آپ واقعی بدصورت ہیں تو ٹیلی فون بند کر لیجئے۔
بدصورتی سے مجھے نفرت ہے۔"

آواز مسکرائی۔ "ایسا ہے تو چلئے میں خوبصورت ہوں۔ میں آپ کے دل
میں نفرت نہیں پیدا کرنا چاہتی۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ من موہن نے پوچھا۔ "کچھ سوچنے لگیں؟"

آواز چونکی۔ "جی نہیں۔ میں آپ سے پوچھنے والی تھی کہ . . . . .

"سوچ لیجئے اچھی طرح۔"

آواز ہنس پڑی۔ "آپ کو گانا سناؤں؟"

"ضرور۔"

"ٹھہریئے۔"

گلہ صاف کرنے کی آواز آئی، پھر غالب کی یہ غزل شروع ہوئی۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل . . . .

سہگل والی نئی دھن تھی۔ آواز میں درد اور خلوص تھا، جب غزل ختم ہوئی تو من موہن نے داد دی۔ "بہت خوب۔ زندہ رہو۔"

آواز شرما گئی "شکریہ" اور ٹیلی فون بند کر دیا۔

دفتر کے بڑے میز پر من موہن کے دل و دماغ میں ساری رات غالب کی غزل گونجتی رہی، صبح جلدی اٹھا اور ٹیلی فون کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کرسی پر بیٹھا رہا مگر ٹیلی فون کی گھنٹی نہ بجی، جب مایوس ہو گیا، تو ایک عجیب سی تلخی اس نے اپنے حلق میں محسوس کی اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے بعد میز پر لیٹ گیا اور کڑھنے لگا، وہی کتاب جس کو وہ متعدد مرتبہ پڑھ چکا تھا، اٹھائی اور ورق گردانی شروع کر دی، یونہی لیٹے لیٹے شام ہو گئی تقریباً سات بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، من موہن نے ریسیور اٹھایا اور تیزی سے پوچھا۔

"کون ہے؟"

وہی آواز آئی "میں"!

من موہن کا لہجہ تیز رہا "اتنی دیر تم کہاں تھیں۔"

آواز لرزی "کیوں ؟"

"میں صبح سے یہاں جھک مار رہا ہوں ۔ ناشتہ کیا ہے نہ دوپہر کا کھانا کھایا ہے حالانکہ میرے پاس پیسے موجود تھے ۔"

آواز آئی "میری جب مرضی ہو گی ٹیلی فون کروں گی ۔ آپ . . . "

من موہن نے بات کاٹ کر کہا "دیکھو جی یہ سلسلہ بند کرو ۔ ٹیلی فون کرنا ہے تو ایک وقت مقرر کرو ۔ مجھ سے انتظار برداشت نہیں ہوتا ۔"

آواز مسکرائی "آج کی معافی چاہتی ہوں ۔ کل سے باقاعدہ صبح اور شام فون آیا کرے گا آپ کو ۔"

"یہ ٹھیک ہے !"

آواز ہنسی "مجھے معلوم نہیں تھا آپ اس قدر بگڑے دل ہیں ۔"

من موہن مسکرایا "معاف کرنا ۔ انتظار سے مجھے بہت کوفت ہوتی ہے ۔ اور جب مجھے کسی بات سے کوفت ہوتی ہے تو اپنے آپ کو سزا دینا شروع کر دیتا ہوں ۔"

"وہ کیسے ؟"

"صبح تمہارا ٹیلی فون نہ آیا ۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ میں چلا جاتا ۔ لیکن بیٹھا دن بھر اندر ہی کڑھتا رہا ۔ بچپنا ہے صاف"

آواز ہمدردی میں ڈوب گئی "کاش مجھ سے یہ غلطی نہ ہوتی ۔ میں نے قصداً

صبح ٹیلی فون نہ کیا ؟"

"کیوں ؟"

"یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آپ انتظار کریں گے یا نہیں ؟"

من موہن ہنسا۔" بہت شریر ہو تم ۔ اچھا اب ٹیلی فون بند کرو۔ میں کھانا کھانے جا رہا ہوں ۔"

"بہتر کب تک لوٹے گا ۔؟"

"آدھے گھنٹے تک ۔"

من موہن آدھے گھنٹے کے بعد کھانا کھا کر لوٹا تو اس نے فون کیا۔ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اس نے غالب کی ایک غزل سنائی من موہن نے دل سے داد دی پھر ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اب ہر روز صبح اور شام من موہن کو اس کا ٹیلیفون آتا گھنٹی کی آواز سنتے ہی وہ ٹیلیفون کی طرف لپکتا بعض اوقات گھنٹوں باتیں جاری رہتیں۔ اس دوران میں من موہن نے اس سے ٹیلی فون کا نمبر پوچھا، نہ اس کا نام شروع میں اس نے اس کی آواز کی مدد سے تخیل کے پردے پر اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی تھی مگر اب وہ جیسے آواز ہی سے مطمئن ہو گیا تھا۔ آواز ہی شکل تھی، آواز ہی صورت تھی آواز ہی جسم تھا، آواز ہی روح تھی۔ ایک دن اس نے پوچھا۔ موہن تم میرا نام کیوں نہیں پوچھتے ؟"

من موہن نے مسکرا کر کہا "تمہارا نام تمہاری آواز ہے۔"

"جو کہ بہت مترنم ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے؟"

ایک دن وہ بڑا ٹیڑھا سوال کر بیٹھی۔ موہن تم نے کبھی کسی لڑکی سے محبت کی ہے؟"

من موہن نے جواب دیا "نہیں!"

"کیوں؟"

من موہن ایک دم اداس ہو گیا۔" اس کیوں کا جواب چند لفظوں میں نہیں دے سکتا مجھے اپنی زندگی کا سارا ملبہ اٹھانا پڑے گا۔ اگر کوئی جواب نہ ملے تو بڑی کوفت ہو گی۔"

"جانے دیجئے۔"

ٹیلیفون کا رشتہ قائم ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا۔ بلاناغہ دن میں دو مرتبہ اس کا فون آتا۔ من موہن کو اپنے دوست کا خط آیا کہ قرضے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ سات آٹھ روز میں وہ بمبئی پہنچنے والا ہے۔ من موہن یہ خط پڑھ کر افسردہ ہو گیا۔ اس کا ٹیلیفون آیا۔ تو من موہن نے اس سے کہا "میری دفتر کی بادشاہی اب چند دنوں کی مہمان ہے۔"

اس نے پوچھا "کیوں؟"

من موہن نے جواب دیا۔ "قرضے کا بندوبست ہو گیا ہے ۔ دفتر آباد ہونے والا ہے ۔"

"تمہارے کسی اور دوست کے گھر میں ٹیلیفون نہیں ؟"

"کئی دوست ہیں جن کے ٹیلیفون ہیں ، مگر میں تمہیں ان کا نمبر نہیں دے سکتا ۔"

"کیوں ؟"

"میں نہیں چاہتا تمہاری آواز کوئی اور سنے ۔"

"وجہ ؟"

"میں بہت حاسد ہوں ۔"

"وہ مسکرائی ۔" یہ تو بڑی مصیبت ہوئی ۔"

"کیا کیا جائے ؟"

"آخری دن جب تمہاری بادشاہت ختم ہونے والی ہو گی میں تمہیں اپنا نمبر بتا دوں گی ۔"

"یہ ٹھیک ہے !"

من موہن کی ساری افسردگی دور ہو گئی ۔ وہ اس دن کا انتظار کرنے لگا کہ دفتر میں اس کی بادشاہت ختم ہو ۔ اب پھر اس نے اس کی آواز کی مدد سے اپنے تخیل کے پردے پر اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش شروع کی ۔ کئی تصویریں بنیں ۔ مگر وہ مطمئن نہ ہوا ۔ اس نے سوچا ، چند دنوں کی بات ہے اس نے ٹیلیفون نمبر دیا تو وہ اسے دیکھ بھی سکے گا ۔ اس کا

خیال آتے ہی اس کا دل و دماغ سن ہو جاتا، میری زندگی کا وہ لمحہ کتنا بڑا لمحہ ہوگا،
جب میں اس کو دیکھوں گا۔"

دوسرے روز جب اس کا ٹیلیفون آیا تو من موہن نے اس سے کہا "تمہیں
دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"تم نے کہا تھا کہ آخری دن جب یہاں میری بادشاہت ختم ہونیوالی ہوگی
تو تم مجھے اپنا نمبر بتا دوگی۔"

"کہا تھا۔"

"اس کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھے اپنا ایڈریس دیدوگی۔ میں تمہیں دیکھ سکونگا۔"
"تم مجھے جب چاہو دیکھ سکتے ہو۔ آج ہی دیکھ لو۔"

"نہیں نہیں۔ پھر کچھ سوچ کر کہا۔" میں ذرا اچھے لباس میں تم سے ملنا چاہتا
ہوں۔ آج ہی ایک دوست سے کہہ رہا ہوں۔ وہ مجھے سوٹ سلوا دے گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ "بالکل بچے ہو تم۔ سنو جب تم مجھ سے ملوگے تو میں تمہیں
ایک تحفہ دوں گی۔"

من موہن نے جذباتی انداز میں کہا "تمہاری ملاقات سے بڑھ کر اور کیا تحفہ
ہو سکتا ہے؟"

"میں نے تمہارے لئے ایگزکٹا کیمرہ خرید لیا ہے۔"

"اوہ !"

"اس شرط پر دوں گی کہ پہلے میرا فوٹو اتارو"

من موہن مسکرایا "اس شرط کا فیصلہ ملاقات پر کروں گا۔"

تھوڑی دیر اور گفتگو ہوئی اس کے بعد ادھر سے وہ بولی "میں کل اور پرسوں تمہیں ٹیلیفون نہیں کر سکوں گی۔"

من موہن نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا "کیوں؟"

"میں اپنے عزیزوں کے ساتھ کہیں باہر جا رہی ہوں۔ صرف دو دن غیر حاضر رہوں گی مجھے معاف کر دینا۔"

یہ سننے کے بعد من موہن سارا دن دفتر ہی میں رہا دوسرے دن صبح اٹھا تو اس نے حرارت محسوس کی۔ سوچا کہ یہ اضمحلال شاید اسلئے ہے کہ اس کا ٹیلیفون نہیں آئے گا۔ لیکن دوپہر تک حرارت تیز ہو گئی۔ بدن تپنے لگا۔ آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگے من موہن میز پر لیٹ گیا۔ پیاس بار بار ستاتی تھی، اٹھتا اور نل سے منہ لگا کر پانی پیتیا۔ شام کے قریب اسے اپنے سینے پر بوجھ محسوس ہونے لگا۔ دوسرے روز وہ بالکل نڈھال تھا۔ سانس بڑی دقت سے آتا تھا۔ سینے کی دکھن بہت بڑھ گئی تھی۔

کئی بار اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوئی۔ بخار کی شدت میں وہ گھنٹوں ٹیلی فون پر اپنی محبوب آواز کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ شام کو اس کی حالت بہت

زیادہ بگڑ گئی۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے کلاک کی طرف دیکھا۔ اس کے کانوں میں عجیب و غریب آوازیں گونج رہی تھیں، جیسے ہزار ہا ٹیلی فون بول رہے ہیں، سینے میں گھنگھرو سے بج رہے تھے۔ چاروں طرف آوازیں ہی آوازیں تھیں، چنانچہ جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس کے کانوں تک اسکی آواز نہ پہنچی۔ بہت دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ ایک دم من موہن چونکا۔ اس کے کان اب سن رہے تھے لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور ٹیلی فون تک گیا۔ دیوار کا سہارا لے کر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا اور خشک ہونٹوں پر لکڑی جیسی زبان پھیر کر کہا۔ "ہیلو"

دوسری طرف سے وہ لڑکی بولی۔ "ہیلو۔ موہن؟"

من موہن کی آواز لڑکھڑائی۔ "ہاں موہن!"

"ذرا اونچی بولو۔"

من موہن نے کچھ کہنا چاہا، مگر وہ اس کے حلق ہی میں خشک ہو گیا۔

آواز آئی۔ "میں جلدی آ گئی — بڑی دیر سے تمہیں رنگ کر رہی ہوں۔ کہاں تھے تم؟"

من موہن کا سر گھومنے لگا۔

آواز آئی۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

من موہن نے بڑی مشکل سے اتنا کہا۔ "میری بادشاہت ختم

ہو گئی آج"۔

اس کے منہ سے خون نکلا اور ایک پتلی لکیر کی صورت میں گردن تک دوڑتا چلا گیا۔

آواز آئی۔ "میرا نمبر نوٹ کر لو۔ فائیو ناٹ تھری ون فور، فائیو ناٹ تھری ون فور۔۔ صبح فون کرنا" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ من موہن اوندھے منہ ٹیلیفون پر گرا۔ اسکے منہ سے خون کے بلبلے پھوٹنے لگے۔

۱۴ جون ۱۹۵۰ء

تقی کاتب

ولی محمد جب تقی کو پہلی مرتبہ دفتر میں لایا تو اس نے مجھے قطعاً متاثر نہ کیا۔ لکھنؤ اور دلی کے جاہل اور خود سر کاتبوں سے میرا جی جلا ہوا تھا۔ ایک تھا اس کو جاؤ بے جا پیش ڈالنے کی بری عادت تھی۔ مُوت کو مُوت اور سُوت کو سوت بنا دیتا تھا۔ میں نے بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہ سمجھا۔ اس کو اپنے اہل زبان ہونے کا بہت زعم تھا۔ میں نے جب بھی اس کو پیش کے معاملے میں ٹوکا۔ اس نے اپنی داڑھی کو تاؤ دے کر کہا "میں اہل زبان ہوں صاحب۔ اس کے علاوہ تیس سپاروں کا حافظ ہوں۔ اعراب کے معاملہ میں آپ مجھ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

میں نے اسے اور کچھ نہ کہا اور رخصت کر دیا۔

اس کی جگہ ایک دلی کے کاتب نے لی۔ اور سب ٹھیک تھا مگر اس کو اصلاح

کرنے کا خبط تھا، اور اصلاح بھی ایسی کہ میری آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ کوئی مضمون تھا میں نے اس میں یہ لکھا: "اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے" اس نے یہ اصلاح فرمائی: "اس کے ہاتھ پاؤں کے طوطے اڑ گئے۔"

میں نے اس کا مذاق اڑایا تو وہ خالص دہلوی لب ولہجہ میں بڑبڑاتا ملازمت سے علیحدہ ہو گیا۔

رام پور کا ایک کاتب تھا بہت ہی خوشخط مگر اس کو اختصار کے دورے پڑتے تھے۔ سطریں کی سطریں اور پیرے کے پیرے غائب کر جاتا تھا۔ جب اس کو پورا صفحہ دوبارہ لکھنے کو کہتا تو وہ جواب دیتا: "اتنی محنت مجھ نہ ہو گی صاحب ۔۔ پوٹ میں لکھ دوں گا۔"

پوٹ میں لکھوانا مجھے سخت ناپسند تھا۔ چنانچہ یہ رام پوری کاتب بھی زیادہ دن دفتر میں نہ ٹک سکے۔

ولی محمد بڈھا کاتب جب تقی کو پہلی مرتبہ دفتر میں لایا تو اس نے مجھے قطعاً متاثر نہ کیا۔ خط کا نمونہ دیکھا۔ خاص اچھا نہیں تھا۔ دائروں میں پختگی نہیں تھی، میں گنجان لکھائی کا قائل ہوں۔ وہ چھدرا لکھتا تھا۔ کم عمر تھا۔ اندازِ گفتگو میں عجیب قسم کی بوکھلاہٹ تھی بات کرتے وقت اس کا ایک بازو ہلتا رہتا تھا۔ جیسے کلاک کا پنڈولم۔ رنگ سفید تھا بالائی ہونٹ پر بھورے مہین بال تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے خود کتابت کی سیاہی سے یہ ہلکی ہلکی مونچھیں بنائی ہیں۔

میں نے اُسے چند روز کے لئے رکھا مگر اس نے اپنی شرافت، محنت اور تابعداری سے دفتر میں اپنے لئے مستقل جگہ پیدا کر لی، ولی محمد سے میرے تعلقات بہت بے تکلف تھے رجنسیات کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے وہ اکثر مجھ سے گفتگو کیا کرتا تھا اس دوران میں محمد تقی خاموش رہتا عورت اور مرد کے جنسی تعلق کا ذکر کھلے الفاظ میں آتا تو اسکے کان کی لویں سُرخ ہو جاتیں، ولی محمد جو کہ شادی شدہ تھا اس کو خالص پنجابی انداز میں چھیڑتا۔

منٹو صاحب اس کا مردہ خراب ہو رہا ہے اس سے کہئے کہ شادی کر لے جب بھی کوئی فلم دیکھ کر آتا ہے ساری رات کروٹیں بدلتا رہتا ہے"

تقی عام طور پر جھینپتے ہوئے کہتا، "منٹو صاحب جھوٹ بولتا ہے"

ولی محمد کی سیاہ نوکیلی مونچھیں تھرکنے لگیں "اور یہ بھی جھوٹ ہے منٹو صاحب کہ یہ چالی بلڈنگ کی یہودی چھوکریوں کی ننگی ٹانگیں دیکھ کر ان کی نقشہ کشی کیا کرتا ہے

تقی کی ناک کی چونچ پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے "میں تو ——— میں تو ڈرائنگ سیکھ رہا ہوں"

ولی محمد اسے اور چھیڑتا "ڈرائنگ چہرے کی سیکھو ——— یہ کس ڈرائنگ ماسٹر نے تم سے کہا کہ پہلے ننگی ٹانگوں سے شروع کرو"۔

محمد تقی قریب قریب رو دیتا چنانچہ میں ولی محمد کو منع کرتا کہ وہ اسے نہ چھیڑا کرے راس پر ولی محمد کہتا "منٹو صاحب، میں اس کے والد صاحب سے کہہ چکا

ہوں آپ سے بھی کہتا ہوں کہ اس لونڈے کی شادی کرا دیجئے، ورنہ اس کا مردہ بالکل خراب ہو جائے گا۔"

محمد تقی کے باپ سے میری ملاقات ہوئی۔ داڑھی والے بزرگ تھے، نماز روزے کے پابند۔ ماتھے پر محراب۔ جھنڈی بازار میں ولی محمد کی شراکت میں گھی کی ایک چھوٹی سی دکان کرتے تھے۔ محمد تقی سے ان کو بہت محبت تھی۔ باتیں کرتے ہوئے آپ نے مجھ سے کہا، "تقی دو برس کا تھا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا — خدا اس کو غریقِ رحمت کرے بہت ہی نیک بی بی تھی۔ منٹو صاحب یقین جانئے اس کی موت کے بعد عزیزوں اور دوستوں نے بہت زور دیا کہ میں دوسری شادی کر لوں مگر مجھے تقی کا خیال تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ میں اس کی طرف سے غافل ہو جاؤں۔ چنانچہ دوسری شادی کے خیال کو میں نے اپنے قریب تک نہ آنے دیا اور اس کی پرورش خود اپنے ہاتھوں سے کی۔ اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اُس نے مجھ گنہگار کو سرخرو کیا۔ خدا اس کو زندگی اور نیکی کی ہدایت دے!"

محمد تقی اپنے باپ کے اس ایثار کی ہمیشہ تعریف کیا کرتا۔ بہت کم باپ اتنی بڑی قربانی کر سکتے ہیں۔ ابا جوان تھے، اچھا کھاتے تھے، چاہتے تو چٹکیوں میں ان کو اچھی سے اچھی بیوی مل جاتی، لیکن میری خاطر انہوں نے تجرد کی زندگی بسر کی۔ اتنی محبت اور اتنے پیار سے میری پرورش کی کہ مجھے ماں کی کمی محسوس ہی نہ ہونے دی۔"

ولی محمد بھی تقی کے باپ کا معترف تھا، مگر اُسے صرف یہ شکایت تھی کہ مولانا ذرا

سنکی ہیں منٹو صاحب آدمی بہت اچھا ہے کاروبار میں سولہ آنے کھرا ہے۔ تقی سے بہت پیار کرتا ہے ــــ لیکن یہ پیار ــــ میں اب اپنے احساسات کن الفاظ میں پیش کروں ــــ اس کا پیار حد سے بڑھا ہوا ہے ــــ یعنی وہ اس طرح پیار کرتا ہے جس طرح کوئی حاسد عاشق اپنے معشوق سے کرتا ہے"

میں نے ولی محمد سے پوچھا "تمہارا مطلب ؟"

ولی محمد نے اپنی مونچھوں کی نوکیں درست کیں "مطلب وطلب میں نہیں سمجھا سکتا آپ خود سمجھ لیجئے"

میں نے مسکرا کر کہا "بھائی تم ذرا وضاحت سے کام لو تو میں سمجھ جاؤں گا"

ولی محمد نے سرخیاں لکھنے والے قلم کو کپڑے کے چیتھڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا "مولانا سنکی ہیں ــــ مجھے معلوم نہیں کیوں تقی کہتا ہے کہ پہلے ان کے پیار اور ان کی شفقت کا یہ رنگ نہیں تھا جواب ہے ــــ یعنی پچھلے چند برسوں سے آپ نے اپنے فرزند ارجمند سے پوچھ گچھ کا لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا ہے ــــ 'لامتناہی' ٹھیک استعمال ہوا ہے نہ منٹو صاحب ؟"

"ٹھیک استعمال ہوا ہے ــــ ہاں یہ پوچھ گچھ کا سلسلہ کیا ہے ؟"

یہی تم رات کو دیر سے کیوں آئے ؟ ــــ سفید گلی میں کیا کرنے گئے تھے۔ وہ یہودن تم سے کیا بات کر رہی تھی ؟ ــــ اتنے فلم کیوں دیکھتے ہو پچھلے ہفتے تم نے کتابت کی اجرت میں سے چار آنے کہاں رکھے ؟ ــــ ولی محمد سے تم باتیں

کلّہ کے پل پر بیٹھے کیا باتیں کر رہے تھے؟ — کیا وہ تمہیں ورغلا تو نہیں رہا تھا کہ شادی کر لو"۔

میں نے ولی محمد سے پوچھا" ورغلانا کیا ہُوا؟"

"معلوم نہیں — لیکن مولانا سمجھتے ہیں کہ تقی کا ہر دوست اُسے شادی کیلئے ورغلاتا ہے — میں اس کو ورغلاتا تو نہیں لیکن یہ ضرور کہتا ہوں اور اکثر کہتا ہوں کہ جانِ من شادی کر لو ورنہ تمہارا مردہ خراب ہو جائے گا — اور منٹو صاحب میں آپ کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ لڑکے کو ایک عدد بیوی کی اشد ضرورت ہے"۔

چار پانچ برس گزر چکے تھے۔ محمد تقی کی مونچھوں کے بھورے بال اب مہین نہیں تھے ہر روز داڑھی مونڈتا تھا، ٹیڑھی مانگ بھی نکالتا تھا اور دفتر میں جب جنسیات کے متعلق گفتگو چھڑتی تو وہ قلم دانتوں میں دبا کر غور سے سنتا۔ عورت اور مرد کے جنسی تعلق کا ذکر کھلے الفاظ میں ہوتا تو اس کے کانوں کی لویں سُرخ نہ ہوتیں — محمد تقی کو بیوی کی ضرورت ہو سکتی تھی۔

ایک دن جبکہ اور کوئی دفتر میں نہیں تھا اور اکیلا تقی تخت پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے پرچے کی آخری کاپی مکمل کر رہا تھا۔ میں نے اس کے خد وخال کا غور سے معائنہ کرتے ہوئے پوچھا۔ تقی تم شادی کیوں نہیں کرتے؟"

سوال اچانک کیا گیا تھا۔ تقی چونک پڑا، "جی؟"

"میرا خیال ہے تم شادی کر لو"

"نقی" نے قلم کان میں اڑسا اور کسی قدر شرما کر کہا "میں نے ابا سے بات کی ہے"

"کیا کہا انہوں نے"؟

تقی تفصیل سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا "جی وہ ——— کچھ نہیں ——— وہ کہتے ہیں" ابھی اتنی جلدی کیا ہے"؟

"تمہارا کیا خیال ہے"؟

"جو اُن کا ہے"؟

اس جواب کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تقی نے پرچے کی آخری کاپی مکمل کی اور اُسے جوڑ کر چلا گیا۔

چند دن کے بعد ولی محمد نے تقی کی موجودگی میں مجھ سے کہا۔ "منٹو صاحب ——— کل بڑا الفڑا ہوا ——— مولانا اور تقی میں دھیں پٹاس ہوتے ہوتے رہ گئی۔"

ولی محمد یوں تو اردو بولتا تھا۔ لیکن پنجابی اور بمبئی کی اردو کے کئی الفاظ مزاح پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنے کا عادی تھا۔

تقی نے اس کی بات سنی اور خاموش رہا۔

ولی محمد نے اپنی تھرکتی ہوئی نوکیلی مونچھوں کو آنکھوں کا زاویہ بدل کر دیکھا پھر اس زاویے کو بدل کر اس نے تقی کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا "لڑکے کو ایک عدد بیوی کی اشد ضرورت ہے، لیکن باپ اس ضرورت کو مانتا ہی نہیں ——— اس نے بہت سمجھایا۔ منٹو صاحب۔ مگر مولانا نے ایک نہ سنی ——— منٹو صاحب یہ کیا محاورہ ہے

ایک نہ سنی ـــــ مولانا نے سنی تو ہزار تھیں، لیکن سنی ان سنی کر دیں ـــــ یہ محاورے بھی خوب چیز ہیں! ـــــ اور مولانا بھی ـــــ اپنے وقت کے ایک لاجواب محاورے ہیں"

تقی بھنا کر مجھ سے مخاطب ہوا "منٹو صاحب اس سے کہئے خاموش رہے"

ولی محمد بولا "منٹو صاحب اس سے کہئے کہ مولانا کے سامنے خاموش رہا کرے ـــــ وہ شادی کی اجازت نہیں دیتے، ٹھیک ہے ـــــ باپ ہیں وہ اس کا نفع نقصان سوچ سکتے ہیں"

باپ بیٹے کی چپقلش ضرور ہوئی تھی، تقی نے مولانا سے درخواست کی تھی کہ وہ اسکی شادی کسی اچھے گھرانے میں کر دیں۔ یہ سن کر وہ چڑ گئے اور تقی کے دوستوں پر برسنے لگے "تمہارے دوستوں نے تمہاری جڑوں میں پانی پھیر دیا ہے ـــــ جب میں تمہاری عمر کا تھا، مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ شادی بیاہ کس جانور کا نام ہے؟"

یہ سن کر تقی نے ڈرتے ڈرتے کہا، لیکن ـــــ آپ کی شادی تو چودہ برس کی عمر میں ہوئی تھی"

مولانا نے اسے ڈانٹا "تمہیں کیا معلوم ہے؟"

تقی خاموش ہو گیا ـــــ وہ بہت ہی کم گو اور فرمانبردار قسم کا لڑکا تھا، دو چار مرتبہ اس نے بے تکلف گفتگو کی اور اس کے کھلنے کا موقع دیا تو مجھے معلوم ہوا، کہ اسکو بیوی کی واقعتاً ضرورت ہے۔ اس نے مجھ سے ایک روز جھینپتے ہوئے کہا میرے

خیالات آج کل بہت پراگندہ رہتے ہیں، ولی محمد شادی شدہ ہے وہ جب اپنی بیوی کے ساتھ باہر جاتا ہے تو میرے دل کو جانے کیا ہوتا ہے —— آپ نے ایک دفعہ احساسِ کمتری کے متعلق باتیں کی تھیں —— مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں عنقریب اس کا شکار ہونے والا ہوں، مگر کیا کروں، ابا مانتے ہی نہیں، میں شادی کی بات کرتا ہوں تو وہ چڑ جاتے ہیں —— جیسے —— جیسے شادی کرنا کوئی گناہ ہے —— وہ اپنی مثال دیتے ہیں کہ دیکھو تمہاری ماں کے مرنے کے بعد اب تک میں نے شادی نہیں کی —— لیکن منٹو صاحب —— اس مثال کا میرے ساتھ کیا تعلق ہے —— اُنہوں نے شادی کی اللہ کو یہ منظور نہیں تھا کہ ان کی بیوی زندہ رہتی اُنہوں نے بہت بڑی قربانی کی جو میری خاطر دوسری شادی نہ کی —— لیکن وہ چاہتے ہیں کہ میں کنوارا ہی رہوں"

میں نے پوچھا "کیوں؟"

تقی نے جواب دیا "معلوم نہیں منٹو صاحب —— وہ میری شادی کے بارے میں کچھ سننے کے لئے تیار ہی نہیں —— میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں، لیکن کل باتوں باتوں میں جذبات سے مغلوب ہو کر میں گستاخی کر بیٹھا"

"کیا؟"

تقی نے انتہائی ندامت کے ساتھ کہا "میں منت سماجت کرتے کرتے اور سمجھا سمجھا کے تنگ آ گیا تھا —— کل جب انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ میری شادی کے

متعلق کچھ سننے کو تیار نہیں تو میں نے غصّے میں آکر اُن سے یہ کہہ دیا۔ آپ نہیں سنیں گے تو میں اپنی شادی کا بندوبست خود کر لوں گا"

میں نے اس سے پوچھا" یہ سن کر انہوں نے کیا کہا"

ابھی ابھی گھر سے نکل جاؤ"۔۔۔۔۔ چنانچہ کل رات میں یہاں دفتر ہی میں سویا"

میں نے شام کو ولی محمد کے ذریعے سے مولانا کو بلایا۔۔۔۔۔ چند جذباتی باتیں ہوئیں تو انہوں نے تقی کو گلے لگا کر رونا شروع کر دیا پھر شکوے ہونے لگے" مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ لڑکا جس کی خاطر میں نے تجرد برداشت کیا ایک روز میرے ساتھ ایسی گستاخی سے پیش آئے گا، میں نے ماؤں کی طرح اسے پالا پوسا آپ سوکھی کھائی پر اس کے لئے خود اپنے ہاتھوں گھی میں گوندھ گوندھ کر پراٹھے پکائے "

میں نے بات کاٹ کر کہا "مولانا، یہ کب آپ کے ان احسانات کو نہیں مانتا، آپ کی تمام قربانیاں اس کے دل و دماغ پر نقش ہیں، آپ نے اتنا کچھ کیا، کیا آپ اس کی شادی نہیں کر سکتے، ماں باپ کی تو سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو پھلتا پھولتا دیکھیں، آپ کے گھر میں بہو آئے گی، بال بچے ہوں گے دادا جان بن کر آپ کو پُر فخر مسرت نہ ہو گی؟۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے تقی کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ آپ شادی کے خلاف ہیں"

مولانا لاجواب ہو گئے، رومال سے اپنی آنکھیں خشک کرنے لگے تھوڑے توقف کے بعد بولے "پر کوئی ایسا رشتہ تو ہو ۔۔۔۔ "

"آپ ہاں کر دیجئے" سب ٹھیک ہو جائے گا"

ولی محمد نے یہ کچھ ایسے انداز میں کہا جیسے انگوٹھا لگا ہے"، مولانا رک گئے "لیکن ایسی جلدی بھی کیا ہے"؛

اس پر میں نے بزرگوں کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا، کارِ خیر میں دیر نہیں ہونی چاہیئے ـــــ آپ اوروں کو چھوڑیئے، خود اپنی پسند کا رشتہ ڈھونڈھئے ـــــ ماشاءاللہ ڈونگری میں سب لوگ آپ کو جانتے ہیں ـــــ یہاں بمبئی میں پسند نہ ہو تو اپنے پنجاب میں سہی، کون سا کالے کوسوں دور ہے"

مولانا نے سر ہلا کر صرف اتنا کہا "جی ہاں"؛

میں نے تقی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، "لو بھئی تقی ـــــ فیصلہ ہو گیا۔ مولانا کو تم ضدی بچوں کی طرح اب تنگ نہ کرنا ـــــ میں خود اس معاملے میں ان کی مدد کروں گا"۔ یہ کہہ کر میں مولانا سے مخاطب ہوا، "یہاں کچھ خاندان ہیں، اُن سے میری جان پہچان ہے میں اپنی بیوی سے کہوں گا، وہ لڑکیاں دیکھ لے گی"؛

تقی نے ہولے سے کہا، "آپ کی بہت مہربانی"

کئی مہینے گزر گئے مگر تقی کی شادی کی بات چیت کہیں بھی شروع نہ ہوئی، ولی محمد اس دوران میں اسے برابر اُکساتا رہا، وہ اپنے باپ کے پیچھے پڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز مولانا میرے پاس آئے اور کہا "سانگلی اسٹریٹ کی تیسری گلی میں نکڑ کی بلڈنگ میں ـــ شاید آپ جانتے ہی ہوں ـــ یو پی کا ایک خاندان رہتا ہے ـــــ"

میں نے فوراً کہا "آپ کہئے ——— میں جانتا ہوں"!

مولانا نے پوچھا "کیسے لوگ ہیں"؟

"بے حد شریف"

"جو سب سے بڑا بھائی ہے، اس کی بڑی لڑکی" میں نے سنا ہے خاصی اچھی ہے!

"میں پیغام بھجوا دیتا ہوں"

مولانا گھبرا گئے "نہیں نہیں ـــ اتنی جلدی نہیں ——— یہ بھی تو دیکھنا ہے، کہ لڑکی شکل و صورت کی کیسی ہے"؟

"میں اپنی بیوی کے ذریعہ سے معلوم کر لوں گا"

میری بیوی نے اس لڑکی کو دیکھا تو پسند کیا، مقبول صورت تھی، تعلیم انٹرنس تک تھی طبیعت کی بہت ہی اچھی تھی، یہ سب خوبیاں مولانا سے بیان کر دی گئیں، وہ لڑکی کے باپ سے ملے جہیز اور حق مہر کے متعلق بات چیت کی یہ ابتدائی مراحل بخیر و خوبی طے ہو گئے، تقی بہت خوش تھا، لیکن تین مہینے گزر گئے اور بات وہیں کی وہیں رہی، آخر ایک روز معلوم ہوا کہ لڑکی والوں نے مزید گفتگو سے انکار کر دیا ہے کیونکہ وہ تقی کے باپ کی مین میخ سے تنگ آچکے ہیں، بار بار وہ اُن سے جا جا کر یہ کہتا تھا، دیکھئے لڑکی کے جہیز میں اتنے جوڑے ہوں برتنوں کی تعداد یہ ہو، لڑکی نے اگر میری عدول حکمی کی تو اس کی سزا طلاق ہو گی، فلم دیکھنے ہرگز نہ جائے گی، پردے میں رہے گی۔

میں نے جب ان بے جا باتوں کا ذکر تقی سے کیا، تو وہ اپنے باپ کی طرف ہو گیا،

نہیں منٹو صاحب، لڑکی والے ٹھیک نہیں، ابّا کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ وہ مجھے زن مُرید بنانا چاہتے ہیں"

میں نے کہا "ایسا ہے تو چھوڑ دو — کسی اور جگہ سہی"

نقّی نے کہا "ابّا کوشش کر رہے ہیں"

مولانا نے ڈونگری میں اپنے ایک واقف کار کے ذریعے سے بات چیت شروع کی سب کچھ طے ہو گیا۔ نکاح کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی، مگر ایک دم کچھ ہوا اور سب کچھ ڈھے گیا — لڑکی والوں کو نقّی پسند تھا، لیکن جب مولانا سے اچھی طرح ملنے جلنے کا اتفاق ہوا تو وہ پیچھے ہٹ گئے اور لڑکی کا رشتہ کسی اور جگہ پکا کر دیا۔ نقّی نے پھر اپنے باپ کی طرفداری کی اور مجھ سے کہا "یہ لوگ بڑے لالچی تھے منٹو صاحب — ایک دولتمند کا لڑکا مل گیا تو اپنی بات سے پھر گئے — ابّا شروع ہی سے کہتے تھے کہ یہ لوگ مجھے ایماندار معلوم نہیں ہوتے، لیکن میں خواہ مخواہ ان کے پیچھے پڑا رہا، کہ جلدی معاملہ طے کیجئے"۔

کچھ عرصے کے بعد تیسری جگہ کوشش شروع ہوئی، یہاں بھی نتیجہ صفر۔ چوتھی جگہ بات چیت شروع ہوئی تو نقّی نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب، وہ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں"

"بڑے شوق سے ملیں"

میں اُن سے ملا، آدمی شریف تھے، مولانا سے ان کی چند مختصر باتیں ہوئیں میں نے

تقی کی تعریف کی معاملہ طے ہو گیا۔ لیکن چند ہی دنوں میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ لڑکی کے بڑے بھائی نے کسی سے سنا کہ مولانا دکان پر اپنے ایک دوست سے کہہ رہے تھے لڑکی میرے کہے پر نہ چلی میں تقی کی دوسری شادی کر دوں گا وہ یہ سن کر میرے پاس آیا میں نے مولانا کو بلایا۔ ان سے پوچھا تو داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے میں نے کیا برا کہا۔ میں ایسی بہو گھر میں نہیں لانا چاہتا جو میرا کہا نہ مانے ـــــ میں تقی کی شادی اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے آرام پہنچے"۔

عجیب و غریب منطق تھی۔ میں نے پوچھا آپ کو آرام ضرور پہنچنا چاہئے مگر آپ کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاوند اور بیوی کا رشتہ آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے"۔

مولانا نے کسی قدر خفگی کے ساتھ کہا "میں خاوند رہ چکا ہوں منٹو صاحب ـــــ آپ کے خیالات میرے خیالات سے بہت مختلف ہیں ـــــ آپ کے ساتھ کام کرکے مجھے افسوس ہے میرے لڑکے کے خیالات بھی بدل گئے ہیں یہ کہہ کر وہ تقی سے مخاطب ہوئے سنا تم نے ـــــ میں ایسی لڑکی گھر میں لانا چاہتا ہوں جو میری اور تمہاری خدمت کرے"

اس کے بعد دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان سے جو میں نے نتیجہ نکالا وہ میں نے تقی کو بتا دیا۔ "دیکھو بھئی ـــــ بات یہ ہے کہ تمہارے والد صاحب تمہاری شادی نہیں کرنا چاہتے ـــــ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر بار کوئی نہ کوئی شوشہ چھیڑ دیتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ تاکہ معاملہ آگے نہ بڑھنے پائے"

مولانا خاموش اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ تقی نے مجھ سے پوچھا کیوں
——— یہ میری شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا "مولانا کا دماغ خراب ہے"
مولانا کو اس قدر طیش آیا کہ منہ میں جھاگ بھر کر واہی تباہی بکنے لگے۔ میں نے تقی
سے کہا جاؤ مولانا کو کسی ذہنی شفاخانہ میں لے جاؤ ——— اور میری یہ بات یاد رکھو۔
جب تک ان کا دماغ درست نہیں ہوگا تمہاری شادی ہرگز ہرگز نہیں کریں گے۔ ان
کی دماغ کی خرابی کا باعث وہ قربانی ہے جو انہوں نے تمہارے لئے کی"۔

مولانا نے تقی کا بازو زور سے پکڑا اور مجھے صلواتیں سناتے چلے گئے۔ ولی محمد
میرے پاس بیٹھا سب کچھ خاموشی سے سن رہا تھا اتنی دیر وہ اپنی نوکیلی مونچھوں کے وجود
سے بالکل غافل رہا جب مولانا اور تقی چلے گئے تو اس نے آنکھوں کا زاویہ درست کر کے
ان کی طرف دیکھا اور کہا مردہ خراب ہو رہا ہے بیچارے کا ——— لیکن منٹو صاحب
آپ نے باون تولہ اور پاؤ رتی کی بات کہی ——— محاورہ درست استعمال ہوا ہے؟
"تم نے محاورہ درست استعمال کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مولانا کی طبیعت صاف
کرتے ہوئے میں نے مناسب و موزوں الفاظ استعمال نہ کئے"

بڑا ملعون آدمی ہے جی!" ولی محمد نے یہ کہکر اپنی مونچھ کا ہٹیلا بال بڑے
زور سے اکھیڑا اور بڑی سنجیدگی اختیار کر کے مجھ سے پوچھا "منٹو صاحب کیا مطلب
تھا آپ کا اس سے کہ مولانا کے دماغ کی خرابی کا باعث وہ قربانی ہے جو اس نے

نقی کے لئے کی، بات ضرور بادن تولہ اور پاؤ رتی کی ہے، لیکن پوری طرح میرے ذہن میں بیٹھی نہیں۔"

میں نے اس کو سمجھایا بیوی کی موت کے بعد ایک وقتی جذبہ تھا جس کے تحت مولانا نے تجرد کے دن گزارنے کا تہیہ کیا یہ جذبہ اپنی طبعی مرا تو آپ کے لئے دو سوگ ہو گئے، ایک بیوی کی موت کا، دوسرا اس جذبے کی موت کا ـــــ وقت گزرتا گیا اور مولانا نیم کے کریلے بنتے گئے ـــ مجھے تو بھئی ولی محمد بہت ترس آتا ہے غریب پر ـــ ایک شخص جس نے پچیس برس تک اپنے اور عورت کے درمیان ایک دیوار حائل رکھی ہو، وہ کس طرح اپنے جوان بیٹے کے پہلو میں ایک جوان عورت دیکھ سکتا ہے ـــ اور وہ بھی نظروں کے بہت قریب!"

دوسرے دن نقی نہ آیا، ولی محمد کے ہاتھ اس نے کتابت کا بل بھجوا دیا جو ادا کر دیا گیا ـــ نقی کو بہت افسوس تھا کہ میں نے اس کے باپ کو برا بھلا کہا، میں نے ولی محمد سے کہہ دیا۔ ـ مجھے کوئی افسوس نہیں ـــ نقی کو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ اس کا باپ ذہنی اور روحانی طور پر بیمار ہے، لیکن مجھے یہ افسوس ضرور ہے کہ اس نے کام چھوڑ دیا ہے۔"

ولی محمد نے نقی سے واپس آنے کو کہا، مگر وہ نہ مانا، اس نے کسی اور دفتر میں ملازمت نہ کی اور دکان پر بیٹھ کر گھی بیچنے لگا، ولی محمد نے جب زور دیا تو اس نے وہیں کتابت کا کام بھی شروع کر دیا۔

میں ایک کام سے دہلی چلا گیا۔ تین چار مہینے وہاں رہ کر بمبئی لوٹا، تو ولی محمد نے پلیٹ فارم ہی پر یہ خبر سنائی کہ تقی کی شادی ایک ہفتہ پہلے بخیر و خوبی ہو چکی ہے۔ مجھے یقین نہ آیا۔ لیکن ولی محمد نے قرآن کی قسم کھا کر کہا "منٹو صاحب میں جھوٹ نہیں کہتا ——— نکاح کے چھوارے میں نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ جس کی شادی نہ ہوتی ہو اُس کے لئے اکسیر ثابت ہوں گے"

میں نے تقی کو بلایا، مگر وہ نہ آیا۔

تقریباً ڈیڑھ مہینے کے بعد ایک دن علی الصبح ولی محمد آیا۔ اس کی نوکیلی مونچھیں تھرک رہی تھیں۔ کہنے لگا "منٹو صاحب کل دھیں پٹاس ہو گئی باپ بیٹے میں ——— تقی اپنی بیوی کو لے کر چلا گیا کہیں"

"کہاں"

"معلوم نہیں" یہ کہہ کر آنکھوں کا زاویہ بدل کر ولی محمد نے اپنی نوکیلی مونچھوں کو دیکھا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا منٹو صاحب ——— لڑائی کا باعث معلوم نہیں ہو سکا ——— مولانا بالکل خاموش ہیں ———"

مولانا بہت دیر تک خاموش رہے اور اُن کا بیٹا محمد تقی بھی۔ بمبئی میں ولی محمد اور اس کے ساتھیوں نے تقی کو بہت تلاش کیا، مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔

بہت دنوں بعد ولی سے مجھے تقی کا ایک خط وصول ہوا۔ لکھا تھا۔ ———

بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں اور حالات سے آگاہ کروں مگر جرأت ساتھ

نہ دیتی تھی ــــ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ یہ خط کسی اور کو نہ دکھایئے گا۔

آپ نے میرے والد کے متعلق جو کچھ کہا تھا ٹھیک نکلا۔ میں نے آپ کی باتوں کا بُرا مانا تھا۔ اس لئے کہ مجھے اصلیت کا علم نہیں تھا جو مجھے شادی کے بعد معلوم ہوئی میرے والد کا دماغ واقعی درست نہیں ہو سکتا ہے پہلے ٹھیک ہو۔ لیکن میری شادی کے بعد تو قطعاً ان کی دماغی حالت درست نہ تھی۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ میں اپنی بیوی سے دور رہوں۔ مجھ میں اور اس میں دوری پیدا کرنے کے لئے وہ عجیب و غریب طریقے ایجاد کرتے تھے۔ جو ایک دیوانہ ہی کر سکتا ہے۔ میں نے بہت دیر تک برداشت کیا ــــ مجھے تمام واقعات بیان کرتے ہوئے بہت شرم محسوس ہوتی ہے ــــ ایک روز میری بیوی غسلخانے میں نہا رہی تھی۔ آپ نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھنا شروع کر دیا ــــ میں اور کیا لکھوں ــــ سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کے دماغ کو کیا ہو گیا ہے۔ خدا ان کی حالت پر رحم کرے۔"

میں یہاں دلّی میں ہوں اور بہت خوش ہوں۔

میں یہ خط پڑھ رہا تھا کہ ولی محمد آیا۔ اسکے پاس نقی کا ایک خط تھا۔ میری طرف بڑھا کر اس نے کہا "یہ خط نقی نے دہلی سے اپنے باپ کو لکھا ہے ــ صرف چند الفاظ ہیں۔"

میں نے پوچھا "کیا"؟

ولی محمد نے کہا "پڑھ لیجئے۔"

میں نے یہ الفاظ پڑھے ۔ "قبلہ والد صاحب — میں یہاں خیریت سے ہوں — آپ نے میرا گھر آباد کیا ہے — میری خواہش ہے کہ آپ بھی اپنا گھر آباد کر لیں ۔"

ولی محمد نے آنکھوں کا زاویہ بدل کر اپنی نوکیلی مونچھوں کو دیکھا اور کہا ۔

"منٹو صاحب — لڑکا ہوشیار ہو گیا ہے — لیکن مولانا تو اپنی بات پکی کر چکے ہیں ۔"

"کہاں"

ولی محمد کی مونچھیں تھرکیں "ایک گھی بیچنے والی ہے — پانچوں گھی میں اور سر کڑاہے میں — محاورا ٹھیک استعمال کیا ہے نا منٹو صاحب ۔"

میں ہنس پڑا ۔

یکم جون ۱۹۵۰ء

والدصاحب

توفیق جب شام کو کلب میں آیا تو پریشان سا تھا۔

دو دو بار ہارنے کے بعد اس نے جمیل سے کہا ؎ لو بھئی میں چلا۔"

جمیل نے توفیق کے گورے چٹے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور کہا

"اتنی جلدی ؟"

ریاض نے تاش کی گڈی کے دو حصّے کر کے انہیں بڑے ماہرانہ انداز میں پھینٹنا شروع کیا۔ اس کی نگاہیں تاش کے پھڑپھڑاتے پتوں پر تھیں۔ لیکن روئے سخن توفیق کی طرف تھا۔ توفی، آج تم پریشان ہو — خلاف معمول اوپر تلے دو دو بار ہارے ہو — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج شام کو ہسپتال میں نرس مارگریٹ نے تمہارے رومانس کو پوٹاشیم برومائڈ پلا دیا۔"

جمیل نے ایک بار پھر غور سے توفیق کے چہرے کی طرف دیکھا "کیوں توفی آج ٹمپریچر کیسا رہا۔"؟

نصیر اپنی کرسی پر سے اٹھا۔ توفیق کی انگلیوں میں پھنسا ہوا سگریٹ نکالا اور زور کا کش لے کر کہنے لگا، سب بکواس ہے — توفی نے آج تک جتنے رومانس لڑائے ہیں سب بکواس تھے — یہ نرس مارگریٹ کا قصّہ تو بالکل من گھڑت ہے — مری کی ٹھنڈی ہواؤں سے یہاں لاہور کی گرمیوں میں آنے کے باعث اسے سرسام ہو گیا ہے۔"

توفیق اٹھ کھڑا ہوا۔ "بکو نہیں؟"

نصیر ہنسا۔ "اگر نہیں ہوا تو آج کل میں ہو جائے گا۔ بتاؤ تمہارے ابا کب تک ہسپتال میں رہیں گے؟" یہ کہہ کر وہ توفیق کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

توفیق نے اپنے کلف لگے ململ کے کرتے کی ڈھیلی آستینوں کو اوپر چڑھایا اور جمیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "چلو چلیں — میری طبیعت یہاں گھبرا رہی ہے"

جمیل اٹھا۔ بھئی توفی۔ تم کوئی بات چھپا رہے ہو — ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"گڑبڑ کچھ نہیں — نصیر کی بکواس سے کون ہے جس کی طبیعت نہیں گھبراتی

توفیق نے جیب سے باجا نکالا اور منہ کے ساتھ لگا کر بجانا شروع کر دیا۔

نصیر نے اپنی ٹانگیں میز پر پھیلا دیں اور زور سے کہا۔ "بکواس ہے۔ سب

بکواس ہے ۔ یہ دھن جو تم بجا رہے ہو رشید عطرے کی ہے ۔ اور رشید عطرے کی کوئی دھن سن کر آج تک کوئی اینگلو انڈین یا کرسچن نرس بے ہوش نہیں ہوئی۔ بہتر ہو گا اگر تم رومال پر تھوڑا سا کلوروفارم چھڑک کر لے جاؤ۔"

ریاض نے تاش کی گڈی رکھدی اور نصیر کی ٹانگیں ایک طرف ریل دیں۔

"کچھ بھی ہو۔ لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ توفی یہاں اپنی گاڑی کا ہارن بجائے تو لڑکیاں سنکر اس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔"

نصیر نے سگریٹ کی گردن ایش ٹرے میں دبائی۔" اور سائیکل کی گھنٹی بجائے تو آسمان سے فرشتے اترنے شروع ہو جاتے ہیں، ایک دفعہ اس کی کھانسی کی آواز سنکر باغ جناح کی ساری بلبلیں اپنی نغمہ سرائی بھول گئی تھیں ۔ بڑا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ ماسٹر غلام حیدر نے پورا ایک مہینہ ان کو ریہرسل کرائی۔ تب جا کر وہ کہیں ٹوں ٹاں کرنے لگیں۔"

توفیق کے سوا باقی سب ہنسنے لگے ۔ نصیر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ اٹھ کر توفیق کے پاس آگیا۔ اس کے کلف لگے ململ کے کرتے کی ایک شکن درست کی۔ اور کہا۔" مذاق برطرف ۔ لو اب بتاؤ، ہسپتال کی لونڈیا سے تمہارا معاملہ کہاں تک پہنچا؟ ۔ میں تو سمجھتا ہوں، وہیں کا وہیں ہو گا۔ ایک شریف آدمی اپنڈے سائٹس کا اپریشن کرائے پڑا ہے ۔ مقررہ اوقات پر یہ تمہاری نرس صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ جناب صرف ایک دفعہ صبح اور ایک دفعہ شام وہاں جا سکتے ہیں۔ مریض اور وہ

بھئی قبلہ والد صاحب ۔ وہ مریضِ اپنڈے سائٹس اور تم مریضِ عشق ۔"

ریاض نے قریب قریب گا کر کہا ۔"مریضِ عشق پر رحمتِ خدا کی "

نصیر کی رگِ مذاق بھڑک اٹھی اور مریضِ عشق پر جب خدا رحمت نازل ہوتی ہے تو وہ بینڈ ماسٹر بن جاتا ہے ۔ آج توفی کا منہ باجا بجا رہا ہے ۔ خدا کی رحمت شاملِ حال رہی تو کل سیکسوفون بجائے گا ۔ آہستہ آہستہ اس کے ساتھ دوسرے مریضانِ عشق شامل ہو جائیں گے ۔ پھر یہ براتوں کے ساتھ منہ میں کلارنٹ دبائے فلمی ٹیونیں بجایا کریگا ۔ ہیرا منڈی سے گزرتے ہوئے اس کی کلارنٹ کا منہ اونچا ہو جایا کریگا ۔ گال دھونکنی کی طرح پھولیں گے ۔ گلے کی رگیں ابھر آئیں گی اور رنڈیاں کوٹھوں پر سے اس پر رحمتِ خداوندی کے پھول برسائیں گی ۔"

توفیق تنگ آگیا ۔ ہاتھ جوڑ کر نصیر سے کہنے لگا ۔" خدا کے لئے یہ بھانڈ پنا بند کرو ۔"

نصیر نے جمیل کی طرف دیکھا ۔" لو صاحب ہم بھانڈ ہو گئے ۔ دنیا بھر کی نقلیں یہ اتاریں ۔ زمانے بھر کی خرافات یہ بکیں ۔ اور بھانڈ ہم کہلائیں ۔ یہ تو آج انہیں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے دیکھ کر میں نے چھیڑ خانی شروع کر دی کہ شاید اسی حیلے اکسیں منہ سے بولیں ، سر سے کھیلیں ۔" ورنہ جائے استاد خالی است " کجا رام رام کجا ٹیں ٹیں "

یہ کہہ کر اس نے توفیق کے کلف لگے ململ کے کرتے کی شکن درست کی ۔" بھئی توفیق ذرا چہکو ۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں ۔"

توفیق نے جیب سے سیگریٹ کیس نکالا، ایک سلگایا اور کش لیتا کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر سے تاش کی گڈی اٹھائی اور پیشنس کھیلنے لگا۔ لیکن نصیر نے لپک کر پتے اٹھا لئے۔

"یہ بڈھے جرنیلوں کا کھیل ہے جو زندگی میں کئی بار اپنی تمام کشتیاں جلا چکے ہوں۔ تم اتنے مایوس کیوں ہو گئے ہو۔ مارگرٹ نہ سہی کوئی اور سہی۔" یہ کہہ کر وہ جمیل اور ریاض سے مخاطب ہوا۔ "یارو بتاؤ یہ قتالہ کون ہے؟۔ خوبصورت ہے؟ چندے آفتاب چندے مہتاب ہے؟۔ پانی پیتی ہے تو گردن میں سے دکھائی دیتا ہے؟"

جمیل توفیق کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ فارسی کا محاورہ کیا ہے۔ لیلیٰ بنظر مجنوں باید دید۔ مارگرٹ بنظر توفی باید دید۔ کیوں توفی؟"

توفیق خاموش رہا۔

"میں پوچھتا ہوں خوبصورت ہے؟۔ اس کے بدن سے آنڈو فارم کی بھینی بھینی بو آتی ہے؟۔ اس کی گردن دیکھ کر گردن توڑ بخار ہوتا ہے یا نہیں؟"

نصیر کہتا کہتا میز پر بیٹھ گیا۔ "میںڈکیوں کو جو زکام ہوتا ہے اس کا علاج تو وہ ضرور جانتی ہو گی۔ خدا کے لئے مجھے اس سے ملاؤ۔ ورنہ مجھ پر ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگیں گے۔"

جمیل نے ریاض کی طرف دیکھا۔ ریاض اس کو کئی مرتبہ دیکھ چکا ہے۔"

"ریاض کے دیکھنے سے کیا ہوتا ہے — اس کو تو اندھ عورتا ہے۔"

نصیر مسکرایا۔

جمیل نے پوچھا "یہ اندھ عورتا کیا ہے؟"

نصیر نے ریاض کے چشمہ لگے چہرے کو گھور کے دیکھا اور جمیل کو جواب دیا۔

"جناب یہ ایک بیماری کا نام ہے اس کے مریض عورتوں کو نہیں دیکھ سکتے، چاہے اصلی پتھر کا چشمہ لگائیں۔"

ریاض مسکرا دیا۔ "شاید اسی لئے مجھے مارگرٹ میں وہ حسن نظر نہ آیا جس کی تعریف میں توفی نے زمین و آسمان کے قلابے ملا رکھے تھے۔"

توفیق نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر ریاض سے صرف اتنا پوچھا "کیا وہ حسین نہیں تھی؟"

ریاض نے جواب دیا "ہرگز نہیں — صاف ستھری لڑکی البتہ ضرور ہے۔"

"لانڈری سے تازہ تازہ آئی ہوئی شلوار کی طرح" نصیر ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ریاض بول پڑا — "ہاں یار — ایک دن اس نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی ان کپڑوں میں اچھی لگتی تھی — میں اور توفی موٹر میں تھے — توفی ڈرائیو کر رہا تھا۔ — موٹر ہسپتال کے پھاٹک میں داخل ہوئی تو اسٹیرنگ توفی کے ہاتھوں کے نیچے پھسلا — لڑکی دیکھ کر ہمیشہ اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے سامنے دیکھا تو وہ شلوار قمیض پہنے مٹکتی چلی آرہی تھی۔ توفی نے موٹر عین اس کے پاس

روکی اور کہا ــــ گڈ مورننگ ــــ وہ مسکرائی ــ لکھنوی انداز سے دایاں ہاتھ ماتھے تک لے گئی ۔ اور کہا ــ آداب عرض . . . . جیسا لباس ویسی بولی . . . لونڈیا ہے چالاک ــ توفی ابھی کوئی فقرہ موزوں کر رہا تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے مگر تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی ــ توفی نے فقرے کو چھوڑا ۔ اور سینے پر دو ہتڑ مار کر کہا ــ مار ڈالا ــ اتنے میں مارگرٹ کا عکس بیک دیو مرر میں نمودار ہوا ۔ توفی نے بڑے تھیٹری انداز میں ایک عدد چمّا اس کی طرف پھینکا اور موٹر اسٹارٹ کر دی ۔ "

" تمہاری اس گفتگو سے ثابت کیا ہوا ؟ " نصیر نے اپنے گھنگھریالے بالوں کا ایک گچھا مروڑتے ہوئے کہا ۔ بات یہ ہے کہ جب تک یہ خاکسار بقلم خود اس لونڈیا کو نہیں دیکھے گا ۔ کچھ بھی ثابت نہیں ہو گا جھوٹ بولوں تو توفی ہی کا منہ کالا ہو ۔ "

توفیق خاموش سگریٹ کے کش لیتا رہا ۔

جمیل نے اپنی کرسی ذرا آگے بڑھائی اور ریاض سے پوچھا " اچھا بھئی یہ بتاؤ توفی نے کبھی اسے موٹر کی سیر نہیں کرائی ۔ "

ریاض نے جواب دیا " ایک دفعہ اس نے کہا تھا تو اس سے مجھے یاد نہیں رہا ، اس نے کیا جواب دیا تھا ۔ بات دراصل یہ ہے کہ توفی کو کھل کے بات کرنیکا موقعہ ہی نہیں ملا ــ ٹمپریچر لینے یا ٹیکہ لگانے کے لئے آتی ہے تو باپ کی موجودگی میں بیر اس سے کیا بات کر سکتا ہے ــــ پھر بھی اشاروں کنایوں میں کچھ نہ کچھ ہو ہی

جاتا ہے ۔ میرا خیال ہے یہ ادائیں آج صرف اسی لئے ہیں کہ اس کے ابا جان دو تین دنوں میں ہسپتال چھوڑنے والے ہیں ۔ کیونکہ زخم اب بالکل بھر چکا ہے ۔ کیوں تونی ؟"

توفیق نے صرف اتنا کہا "مجھے ستاؤ نہیں یار" ۔ اور اٹھ کر باہر باغ میں چلا گیا ۔

نصیر نے اپنی ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑی اور چہرے پر گہری فکر مندی کے نشانات پیدا کر کے کہا "کہیں لمڈے کو اسک تو نہیں ہو گیا ۔"

" تونی اور عشق ۔۔ دو متضاد چیزیں ہیں ۔" ریاض کرسی پہ سے اٹھا ۔ اور سنجیدگی سے کہنے لگا "کوئی اور ہی چیز ہوئی ہے جناب کو ۔ میرا خیال ہے لاہور میں اس کا جی لگ گیا تھا ۔ والد ٹھیک ہو گئے ہیں تو اب اسے واپس ہی جانا پڑے گا ۔"

" بکواس ہے ۔" نصیر چلایا " کوئی اور ہی بات ہے ۔ تم یہاں ٹھہرو ۔ میں ابھی دریافت کر کے آتا ہوں ۔"

نصیر اُٹھ کر باہر چلنے لگا تو جمیل نے اسے پوچھا ۔ "کس سے دریافت کرنے چلے ہو ۔"

نصیر مسکرایا ۔ "گھوڑے کے منہ سے ۔ انگریزی میں فرُدم دی ہارسز ماؤتھ !"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا ۔

جمیل نے ریاض کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے پوچھا ۔ ہاں بھئی ریاض

یہ سلسلہ کیا ہے۔ تونی ایک دن بہت تعریف کر رہا تھا۔ اس مارگرٹ کی۔ کہتا تھا کہ معاملہ پٹا سمجھو۔ کیا یہ ٹھیک ہے ؟"

"ٹھیک ہی ہوگا۔ میرا مطلب ہے ایسا کون سا چتوڑ گڑھ کا قلعہ ہے جو تونی کو سر کرنا ہے۔ ایک دن کوری ڈور میں کافی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے ؟"

"کیا ؟"

"میں نے پاکٹ بک میں نوٹ کی ہوئی ہیں۔ کسی روز پڑھ کے تمہیں سناؤں گا۔"

جمیل کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔" مذاق کرتے ہو یار۔ سناؤ۔ کوئی اور بات سناؤ۔ میرا مطلب ہے یہ بتاؤ کہ میں کبھی اس نرس کو دیکھ سکتا ہوں۔"

"جب چاہو دیکھ سکتے ہو۔ ہسپتال چلے جاؤ، فیملی وارڈ میں تمہیں نظر آجائے گی۔ لیکن کیا کرو گے دیکھ کر۔ تمہارا قد بہت چھوٹا ہے وہ تم سے پوری ایک بالشت اونچی ہے۔"

اس قد نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ بہتیرے علاج کروا چکا ہوں۔ ایک سوئی برابر اونچا نہیں ہوا۔ اچھا، میں نے کہا، "ریاض۔ باپ کی موجودگی میں تونی اس سے اشارے بازی کیسے کرتا ہوگا۔ نہیں، لڑکا ہوشیار ہے۔!"

ریاض نے تاش کی گڈی اٹھائی اور پتے پھینٹنے شروع کیے ۔ اچھی خاصی مصیبت ہے۔ ہر وقت یہی دھڑکا کہ والد دیکھ نہ لے، تاڑ نہ جائے ۔ کہتا تھا۔ جونہی ان کی نگاہیں میری طرف اٹھتی تھیں۔ میں نظریں نیچی کر لیتا تھا۔ جب وہ آتی تھی تو دس پندرہ منٹوں میں غریب کو صرف تین چار موقعے آنکھ لڑانے کو ملتے تھے۔"

جمیل نے پوچھا:"ڈی ایس پی ہیں نا توفی کے ابا جان۔"

"ہاں بھائی ۔ باپ ہونا ہی کافی ہوتا ہے ۔ اوپر سے ڈی ایس پی۔"

جمیل نے آہ بھری۔"میرے تمام رومانس غارت کرنے والے ۔ میرے ابا جان ہیں ۔ حج سے پہلے ان کی غارتگری اتنے زوروں پر نہ تھی۔ پر جب سے آپ خانہ کعبہ سے واپس تشریف لائے ہیں، آپ کی غارت گری عروج پر ہے۔ سوچتا ہوں شادی کر لوں، ایک لڑکا پیدا کروں اور بیٹھا اس سے اپنا انتقام لیتا رہوں۔"

ریاض مسکرایا۔"حج کرنے جاؤ گے؟"

"ایک نہیں دس دفعہ ۔ صاحب زادے کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے میز پر زور سے مکّا مارا۔ آواز کے ساتھ ہی نصیر داخل ہوا۔ ریاض اور جمیل دونوں اس کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ نصیر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ جمیل کے دماغ میں گُدبد ہونے لگی۔"کچھ دریافت کیا؟"

"سب کچھ" نصیر کا جواب مختصر تھا۔

ریاض نے پوچھا۔"تو فی کہاں ہے؟"

نصیر نے جواب دیا۔"چلا گیا ہے؟"

"کہاں" یہ سوال ریاض نے کیا۔

"واپس مری"

نصیر کا یہ جواب سن کر ریاض اور جمیل دونوں بیک وقت بولے"مری واپس"

"جی ہاں ۔ مری واپس چلا گیا ہے۔ اپنی موٹر میں ۔ ہسپتال سے سیدھا یہاں کلب آیا ۔ یہاں سے سیدھا مری روانہ ہو گیا ہے"

نصیر نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

جمیل بے چین ہو گیا۔ آخر ہوا کیا؟"

نصیر نے جواب دیا۔"حادثہ!"

جمیل اور ریاض دونوں بولے"کیسا حادثہ؟"

"بتاتا ہوں" یہ کہہ کر نصیر نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی جس میں کوئی سگریٹ نہیں تھا۔ ڈبیا ایک طرف پھینک کر وہ ریاض اور جمیل سے مخاطب ہوا۔

"معاملہ بہت سنگین ہے؟"

جمیل نے ریاض سے کہا۔"میرا خیال ہے تو فی پکڑا گیا ہو گا!"

ریاض نے کہا۔"معلوم ایسا ہی ہوتا ہے ۔ آدمی کب تک کسی کی آنکھوں

ہیں دھول جھونک سکتا ہے۔ ڈی۔ ایس۔ پی ہے۔ فوراً تاڑ گیا ہو گا۔ لیکن نصیر تم بتاؤ۔ توفی نے تم سے کیا کہا۔"

"بتاتا ہوں۔ ایک سگریٹ دینا جمیل۔"

جمیل نے اس کو ایک سگریٹ دیا۔ اسے سلگا کر اس نے بات شروع کی۔ باپ کی موجودگی میں اس کی نرس سے اشارہ بازی ہوتی تھی۔ یہ تم لوگوں کو معلوم ہے۔ یہ سلسلہ اشارے بازی کا بہت دنوں سے جاری تھا۔ توفی اس میں خاصا کامیاب رہا تھا۔ باپ کی موجودگی کے باعث اسے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا وہ ذرا گردن گھمانے، تو یہ فوراً اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا۔ ان دقتوں کے باوجود اس نے لڑکی سے ربط بڑھا ہی لیا۔ اوف ڈیوٹی کے روز شام کو وہ اسے ایک مرتبہ سینما بھی لے گیا۔"

جمیل گڈ کا "واہ!"

ریاض نے کہا "مجھ سے اس نے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

نصیر نے سگریٹ کا کش لیا "سینما میں وہ خوب ایک دوسرے کیساتھ گھل مل گئے۔ نرس کو توفی کا چنچل پنا بہت پسند آیا۔ پرسوں کی ملاقات میں آج کی شام طے ہوئی کہ وہ توفی کے ساتھ دور تک موٹر میں سیر کرنے چلے گی۔ اور توفی اپنی عادت سے مجبور ہو کر اگر کوئی شرارت کرنا چاہے گا تو وہ برا نہیں مانے گی۔"

جمیل پھر گڈ کا "واہ!"

ریاض نے اسے ٹوکا "خاموش رہو جمیل "

نصیر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا "پرسوں کی ملاقات میں جو کچھ طے ہوا تھا میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ ٹونی بہت خوش تھا۔ اپنے خیال کے مطابق وہ ایک بہت بڑا میدان مارنے والا تھا۔ آج دن بھر وہ اسکیمیں بناتا رہا ۔ پٹرول کا انتظام اس نے کر لیا۔

کرم الٰہی نے اسے چھ کوپن دے دیئے تھے۔ اسی کی پرمٹ پہ بیئر کی چھ بوتلیں بھی حاصل کر لی تھیں، جو غالباً ابھی تک انتیاز کے فرجڈیئر میں ٹھنڈی ہو رہی ہیں ۔ ٹونی کی اسکیم یہ تھی کہ چنیوٹ کے پل تک چلیں گے۔ حسن و عشق کے دریا چناب کی لہریں ہوں گی ۔ موسم بھی خوشگوار ہو گا۔ گلاس راستے میں خریدیں گے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر اڑے گی خوب سرور جمیں گے ۔ لیکن۔ . . . " یہ کہہ کر نصیر ایک دم خاموش ہو گیا۔

جمیل نے بے چین ہو کر پوچھا "سارا معاملہ غارت ہو گیا؟"

نصیر نے اثبات میں سر ہلایا "سارا معاملہ غارت ہو گیا "

جمیل نے اور زیادہ بے چین ہو کر پوچھا۔ "کیسے؟"

نصیر نے سگریٹ کی گردن ایش ٹرے میں دبائی اور کہا۔ "پروگرام یہ تھا کہ وہ شام کو چھ بجے ہسپتال جائے گا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اپنے باپ کے پاس بیٹھے گا۔ اس دوران میں جب مارگرٹ آئے گی تو وہ سیر کی بات پکی کر لے گا، بات پکی

ہو جائے گی تو وہ سیدھا امتیاز کے ہاں جائے گا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے گا۔ بیئر کی ایک بوتل پیئے گا۔ باقی پانچ موڑ میں رکھے گا اور جو جگہ مقرر ہوئی ہو گی، وہاں مارگرٹ سے جا ملے گا۔ دل و دماغ سخت بے چین تھا، گھر سے وقت سے کچھ پہلے ہی نکل آیا، ہسپتال پہنچا، موٹر ایک طرف کھڑی کی۔ وارڈ کی طرف چلا، سیڑھیاں طے کیں، اوپر پہنچا، کمرے کا دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہے۔"

نصیر ایک دم رک گیا، جمیل اور ریاض دونوں بیک وقت بولے "کیا دیکھتا ہے؟"

"دیکھتا ہے کہ — ٹھہرو" نصیر تھوڑی دیر کے لیے رکا "میں توفی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں — میں نے کمرے کا دروازہ کھولا، کیا دیکھتا ہوں — کہ مارگرٹ پلنگ پر جھکی ہوئی ہے اور والد صاحب — اور والد صاحب اس کے ہونٹ چوس رہے ہیں۔"

جمیل اور ریاض قریب قریب اچھل پڑے "سچ؟"

نصیر نے جواب دیا "دروغ برگردنِ راوی"

جمیل جس کے دل و دماغ پر حیرت مسلط تھی بڑبڑایا "کمال کر دیا ڈی ایس پی صاحب نے۔"

ریاض نے نصیر سے پوچھا "توفی نے کیا کیا؟"

نصیر نے جواب دیا "آنکھیں نیچی کر لیں اور چلا آیا۔"

جمیل ریاض سے مخاطب ہوا" میرے والد صاحب قبلہ کبھی ایسے نظارے کا موقعہ دیں تو مزا آجائے۔ پتہ نہیں توفی کیوں اس قدر پریشان تھا ؟"

نصیر نے کہا" توفی کی والدہ صاحبہ اس کے ساتھ تھیں ۔ توفی نے مجھ سے کہا ۔ میں تو نظریں نیچی کر کے چل دیا۔ لیکن امی جان دروازہ کھول کر اندر کمرے میں چلی گئیں۔

جمیل نے پُر افسوس لہجے میں کہا" قبلہ والد صاحب کے ساتھ زیادتی ہوئی۔

۲؍جون سنہ ۱۹۵۰ء

عورت ذات

مہاراجہ گ سے ریس کورس پر اشوک کی ملاقات ہوئی، اس کے بعد دونوں بے تکلف دوست بن گئے۔

مہاراجہ گ کو ریس کے گھوڑے پالنے کا شوق ہی نہیں خبط تھا۔ اسکے اصطبل میں اچھی سے اچھی نسل کا گھوڑا موجود تھا اور محل میں جس کے گنبد ریس کورس سے صاف دکھائی دیتے تھے طرح طرح کے عجائب موجود تھے۔

اشوک جب پہلی بار محل میں گیا تو مہاراجہ گ نے کئی گھنٹے صرف کرکے اس کو اپنے تمام نوادر دکھائے۔ یہ چیزیں جمع کرنے میں مہاراجہ کو ساری دنیا کا دورہ کرنا پڑا تھا، ہر ملک کا کونہ کونہ چھاننا پڑا تھا۔ اشوک بہت متاثر ہوا چنانچہ اس نے نوجوان مہاراجہ گ کے ذوقِ انتخاب کی خوب داد دی۔

ایک دن اشوک گھوڑوں کے ٹپ لینے کے لئے مہاراجہ کے پاس گیا۔ تو وہ ڈارک روم میں فلم دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشوک کو وہیں بلوا لیا۔ سکسٹین ملی میٹر فلم تھی جو مہاراجہ نے خود اپنے کیمرے سے لئے تھے۔ جب پروجیکٹر چلا تو پچھلی ریس پوری کی پوری پردے پر دوڑ گئی۔ مہاراجہ کا گھوڑا اس ریس میں ون آیا تھا۔

اس فلم کے بعد مہاراجہ نے اشوک کی فرمائش پر اور کئی فلم دکھائے سوئٹزرلینڈ، پیرس، نیویارک، ہونولولو، ہوائی، وادیٔ کشمیر — اشوک بہت محظوظ ہوا۔ یہ فلم قدرتی رنگوں میں تھے۔

اشوک کے پاس بھی سکسٹین ملی میٹر کیمرہ اور پروجیکٹر تھا۔ مگر اس کے پاس فلموں کا اتنا ذخیرہ نہیں تھا۔ دراصل اس کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ اپنا یہ شوق جی بھر کے پورا کر سکے۔

مہاراجہ جب کچھ فلم دکھا چکا تو اس نے کمرے میں روشنی کی اور بڑی بے تکلفی سے اشوک کی ران پر دھپا مار کر کہا "اور سناؤ دوست!"

اشوک نے سگریٹ سلگایا "مزا آگیا فلم دیکھ کر۔"

"اور دکھاؤں"

"نہیں نہیں۔"

"نہیں بھئی ایک ضرور دیکھو۔ مزا آجائیگا تمہیں۔" یہ کہہ کر مہاراجہ گ نے ایک صندوقچہ کھولکر ایک ریل نکالی اور پروجیکٹر پر چڑھا دی "ذرا اطمینان سے دیکھنا۔"

اشوک نے پوچھا "کیا مطلب ؟"

مہاراجہ نے کمرے کی لائٹ اوف کر دی "مطلب یہ کہ ہر چیز غور سے دیکھنا"

یہ کہہ کر اس نے پروجیکٹر کا سوئچ دبا دیا۔

پردے پر چند لمحے صرف سفید روشنی تھرتھراتی رہی، پھر ایک دم تصویریں شروع ہوگئیں۔ ایک الف ننگی عورت صوفے پر لیٹی تھی۔ دوسری سنگار میز کے پاس کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔

اشوک کچھ دیر خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ایک دم اسکے حلق سے عجیب وغریب آواز نکلی۔ مہاراجہ نے ہنس کر اس سے پوچھا "کیا ہوا ؟"

اشوک کے حلق سے آواز پھنس پھنس کر باہر نکلی "بند کرو یار بند کرو۔"

"کیا بند کرو ؟"

اشوک اٹھنے لگا مگر مہاراجہ گ نے اسے پکڑ کر بٹھا دیا "یہ فلم تمہیں پورے کا پورا دیکھنا پڑے گا۔"

فلم چلتا رہا۔ پردے پر برہنگی منہ کھولے ناچتی رہی، مرد اور عورت کا جنسی رشتہ مادر زاد عریانی کے ساتھ تھرکتا رہا۔ اشوک نے سارا وقت بے چینی میں کاٹا۔ جب فلم بند ہوا۔ اور پردے پر صرف سفید روشنی تھی تو اشوک کو ایسا محسوس ہوا کہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا پروجیکٹر کی بجائے اسکی آنکھیں پھینک رہی ہیں۔

مہاراجہ گ نے کمرے کی لائٹ اون کی اور اشوک کی طرف دیکھا اور ایک

زور کا قہقہہ لگایا ـ کیا ہوگیا ہے تمہیں ؟"

اشوک کچھ سکڑ سا گیا تھا، ایک دم روشنی ہونے کے باعث اسکی آنکھیں بھینچی ہوئی تھیں، ماتھے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے تھے. مہاراجہ گ نے زور سے اس کی ران پر دھپا مارا، اور اس قدر بے تحاشا ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اشوک صوفے پر سے اٹھا، رومال نکال کر اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا ـ

"کچھ نہیں یار ـ"

"کچھ نہیں کیا ـ مزا نہیں آیا ـ"

اشوک کا حلق سوکھا ہوا تھا، تھوک نگل کر اس نے کہا ـ "کہاں سے لائے یہ فلم ؟"

مہاراجہ نے صوفے پر لیٹتے ہوئے جواب دیا "پیرس سے ـــ پے رس ـ پے رس !"

اشوک نے سر کو جھٹکا سا دیا ـ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا !"

"کیا ؟"

"یہ لوگ ـ میرا مطلب ہے کیمرہ کے سامنے یہ لوگ کیسے . . . ؟"

"یہی تو کمال ہے ـ ہے کہ نہیں ؟"

"ہے تو سہی" ـ یہ کہہ کر اشوک نے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کیں ـ "ساری تصویریں جیسے میری آنکھوں میں پھنس سی گئی ہیں ـ"

مہاراجہ گنگنا اٹھا "میں نے ایک دفعہ چند لیڈیز کو یہ فلم دکھایا۔"

اشوک چلّایا "لیڈیز کو ؟"

"ہاں ہاں ۔ بڑے مزے لے لے کر دیکھا انہوں نے ۔"

"غلط "

مہاراجہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "سچ کہتا ہوں ۔ ایک دفعہ دیکھ کر دوسری دفعہ پھر دیکھا، چیخیں، چلاتی اور ہنستی رہیں"

اشوک نے اپنے سر کو جھٹکا سا دیا "حد ہوگئی ہے ۔ میں تو سمجھتا تھا وہ بیہوش ہو گئی ہوں گی"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن انہوں نے خوب لطف اٹھایا۔"

اشوک نے پوچھا "کیا یورپین تھیں ؟"

مہاراجہ نے کہا "نہیں بھائی ۔ اپنے دیس کی تھیں ۔ مجھ سے کئی بار یہ فلم اور پروجکٹر مانگ کر لے گئیں ۔ معلوم نہیں کتنی سہیلیوں کو دکھا چکی ہیں ۔"

میں نے کہا "اشوک کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا ؟"

ایک دو روز کے لئے یہ فلم دے سکتے ہو مجھے ؟"

"ہاں ہاں لے جاؤ !" یہ کہہ کر مہاراجہ نے اشوک کی پسلیوں میں ٹھونکا دیا۔

"سالے کس کو دکھائے گا۔"

"دوستوں کو"

"دکھا جس کو بھی تیری مرضی!" یہ کہہ کر مہار لھگ نے پروجیکٹر میں سے فلم کا اسپول نکالا۔ اس کو دوسرے اسپول پر چڑھا دیا اور ڈبہ اشوک کے حوالے کر دیا۔

"لے پکڑ۔ عیش کر!"

اشوک نے ڈبہ ہاتھ میں لے لیا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ گھوڑدوڑ کے ٹپ لینا بھول گیا اور چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔

گھر سے پروجیکٹر لے جا کر اس نے کئی دوستوں کو یہ فلم دکھایا تقریباً سب کے لئے انسانیت کی یہ عریانی بالکل نئی چیز تھی۔ اشوک نے ہر ایک کا ردِ عمل نوٹ کیا۔ بعض نے خفیف سی گھبراہٹ اور فلم کا ایک ایک انچ غور سے دیکھا بعض نے تھوڑا سا دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بعض آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود فلم کو تمام و کمال طور نہ دیکھ سکے۔ ایک برداشت نہ کر سکا اور اٹھ کر چلا گیا۔

تین چار روز کے بعد اشوک کو فلم لوٹانے کا خیال آیا تو اس نے سوچا کیوں نہ اپنی بیوی کو دکھاؤں، چنانچہ وہ پروجیکٹر اپنے گھر لے گیا۔ رات ہوئی تو اس نے اپنی بیوی کو بلایا۔ دروازے بند کئے، پروجیکٹر کا کنکشن وغیرہ کیا ــ فلم نکالا۔ اس کو فٹ کیا کمرے کی بتی بجھائی اور فلم چلا دیا۔

پردے پر چند لمحات سفید روشنی تھرتھرائی، پھر تصویریں شروع ہوئیں۔ اشوک کی بیوی زور سے چیخی، تڑپی، اچھلی اسکے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلیں۔ اشوک نے

اسے پکڑ کر بیٹھانا چاہا تو اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور چیخنا شروع کر دیا ۔۔
"بند کرو ۔۔ بند کرو ۔"

اشوک نے ہنس کر کہا "ارے بھئی دیکھ لو ۔ شرماتی کیوں ہو"

"نہیں نہیں" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا ۔

اشوک نے اسکو زور سے پکڑ لیا ۔ وہ ہاتھ جو اس کی آنکھوں پر تھا ۔ ایک طرف کھینچا ۔ اس کھینچا تانی میں دفعتہً اشوک کی بیوی نے رونا شروع کر دیا ۔ اشوک کو بریک سی لگ گئی ، اس نے تو محض تفریح کی خاطر اپنی بیوی کو فلم دکھایا تھا ۔

روتی اور بڑبڑاتی اس کی بیوی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی ، اشوک چند لمحات بالکل خالی الذہن بیٹھا ننگی تصویریں دیکھتا رہا ، جو حیوانی حرکات میں مشغول تھیں ۔ پھر ایک دم اس نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کیا ، اس احساس نے اسے خجالت کے سمندر میں غرق کر دیا ۔۔ اس نے سوچا مجھ سے بہت ہی نازیبا حرکت سرزد ہوئی ، لیکن حیرت ہے کہ مجھے اس کا خیال تک نہ آیا ۔۔ دوستوں کو دکھایا تھا ۔۔ ٹھیک تھا ۔۔ گھر میں اور کسی کو نہیں ، اپنی بیوی ۔۔ اپنی بیوی کو . . . . اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا ۔

فلم چل رہا تھا ۔ مادر زاد برہنگی مختلف آسن اختیار کرتی دوڑ رہی تھی ، اشوک نے اٹھ کر سوئچ آف کر دیا ۔ پردے پر سب کچھ بجھ گیا ، مگر اس نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں ۔ اس کا دل و دماغ شرمساری میں ڈوبا ہوا تھا ۔ یہ احساس

اسکو چبھ رہا تھا کہ اس سے ایک نہایت ہی نازیبا۔ نہایت ہی واہیات حرکت سرزد ہوئی ہے اس نے یہاں تک سوچا کہ وہ کیسے اپنی بیوی سے آنکھ ملا سکے گا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک سگریٹ سلگا کر اس نے احساس ندامت کو مختلف خیالوں کے ذریعہ سے دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دیر دماغ میں ادھر ادھر ہاتھ مارتا رہا۔ جب چاروں طرف سے سرزنش ہی سرزنش ہوئی تو بیچ پیچ ہو گیا۔ اور ایک عجیب سی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ جس طرح کمرے میں اندھیرا ہے اسی طرح اسکے دماغ پر بھی اندھیرا چھا جائے۔

بار بار اسے یہ چیز ستا رہی تھی۔ "ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔" پھر وہ سوچتا۔ "بات اگر ساس تک پہنچ گئی۔ سالیوں کو پتہ چل گیا۔ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ یہ لوگ کہ ایسے گرے ہوئے اخلاق کا آدمی نکلا۔ ایسی گندی ذہنیت کہ اپنی بیوی کو . . . . ."

تنگ آکر اشوک نے سگرٹ سلگایا۔ وہ ننگی تصویریں جو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ ان کے عقب میں اسے اپنی بیوی کا چہرہ نظر آتا۔ حیران و پریشان۔ جس نے زندگی میں پہلی بار عفونت کا اتنا بڑا ڈھیر دیکھا ہو۔ سر جھٹک کر اشوک اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مگر اس سے بھی اس کا اضطراب دور نہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بے پاؤں کمرے سے باہر نکلا۔ ساتھ والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی بیوی منہ سر لپیٹ کر لیٹی ہوئی تھی۔ کافی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ اندر جاکر

مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگے۔ مگر خود میں اتنی جرأت پیدا نہ کر سکا۔ اُلٹے پاؤں لوٹا اور اندھیرے کمرے میں صوفے پر لیٹ گیا۔ دیر تک جاگتا رہا۔ آخر سو گیا۔

صبح سویرے اُٹھا۔ رات کا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اشوک نے بیوی سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور ناشتہ کئے بغیر نکل گیا۔

آفس میں اس دن دل لگا کر اس نے کوئی کام نہ کیا۔ یہ احساس اس کے دل و دماغ کیساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔ "ایسی واہیات حرکت، اور مجھے خیال تک نہ آیا۔"

کئی بار اس نے گھر بیوی کو ٹیلی فون کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ہر بار نمبر کے آدھے ہندسے گھما کر ریسیور رکھ دیا۔ دوپہر کو گھر سے جب اس کا کھانا آیا تو اس نے نوکر سے پوچھا۔

"میم صاحب نے کھانا کھا لیا؟"

نوکر نے جواب دیا "جی نہیں۔" — وہ کہیں باہر گئے ہیں۔"

"کہاں؟"

"معلوم نہیں صاحب!"

"کب گئے تھے؟"

"گیارہ بجے۔"

اشوک کا دل دھڑکنے لگا۔ بھوک غائب ہو گئی۔ دو چار نوالے کھائے اور ہاتھ اٹھا لیا۔ اس کے دماغ میں ہلچل مچ گئی تھی۔ طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ "گیارہ بجے۔ ابھی تک لوٹی نہیں۔ گئی کہاں ہے۔ ماں کے پاس؟ کیا وہ اسے سب کچھ

بتا دیگی ؟ ۔ ضرور بتائے گی ۔ ماں سے بیٹی سب کچھ کہہ سکتی ہے ۔ ہو سکتا ہے بہنوں کے پاس گئی ہو ۔ سنیں گی تو کیا کہیں گی ؟ ۔ دونوں میری کتنی عزت کرتی تھیں ۔ جانے بات کہاں سے کہاں پہنچے گی ۔ ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا ۔ "

اشوک آفس سے باہر نکل گیا ۔ موٹر لی اور ادھر ادھر آوارہ چکر لگاتا رہا ۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے موٹر کا رخ گھر کی طرف پھیر دیا ۔ " دیکھا جائے گا جو کچھ ہوگا ۔ "

گھر کے پاس پہنچا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ جب لفٹ ایک دھچکے کے ساتھ اوپر اٹھی تو اس کا دل اچھل کر اس کے منہ میں آگیا ۔

لفٹ تیسری منزل پر رکی ۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے دروازہ کھولا ۔ اپنے فلیٹ کے پاس پہنچا تو اس کے قدم رک گئے اس نے سوچا کہ لوٹ جائے ۔ مگر فلیٹ کا دروازہ کھلا اور اس کا نوکر بیڑی پینے کیلئے باہر نکلا ۔ اشوک کو دیکھ کر اس نے بیڑی ہاتھ میں چھپا لی اور سلام کیا ۔ اشوک کو اندر داخل ہونا پڑا ۔

نوکر پیچھے پیچھے آرہا تھا ۔ اشوک نے پلٹ کر اس سے پوچھا " میم صاحب کہاں ہیں "

نوکر نے جواب دیا " اندر کمرے میں ! "

" اور کون ہے ؟ "

" ان کی بہنیں صاحب ۔ کولابے والے صاحب کی میم صاحب اور دو پارسی بائیاں ! "

یہ سن کر اشوک بڑے کمرے کی طرف بڑھا ۔ دروازہ بند تھا ۔ اس نے دھکا دیا ۔ اندر

سے اشوک کی بیوی کی پتلی مگر تیز آواز آئی — "کون ہے ؟"

نوکر بولا "صاحب"

اندر کمرے میں ایک دم گڑبڑ شروع ہو گئی۔ چیخیں بلند ہوئیں۔ دروازوں کی چٹخنیاں کھلنے کی آوازیں آئیں، کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ ہوئی۔ اشوک کوری دوڑ سے ہوتا پچھلے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ پر چیکر چل رہا ہے اور پرسے پردوں کی روشنی میں دھندلی دھندلی انسانی شکلیں ایک نفرت انگیز میکانکی یک آہنگی کے ساتھ حیوانی حرکات میں مشغول ہیں۔

اشوک بے تحاشا ہنسنے لگا۔

۴؍جون ۱۹۵۰ء

عشق حقیقی

عشق و محبت کے بارے میں اخلاق کا نظریہ وہی تھا جو اکثر عاشقوں اور محبت کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ وہ رانجھے ہیر کا چیلا تھا، عشق میں مر جانا اس کے نزدیک عظیم الشان موت مرنا تھا۔

اخلاق تیس برس کا ہو گیا۔ مگر باوجود کوششوں کے اس کو کسی سے عشق نہ ہوا لیکن ایک دن انگرڈ برگ مین کی پکچر "فور ہوم دی بل ٹولز" کا میٹنی شو دیکھنے کے دوران میں اس نے محسوس کیا، اس کا دل اس برقعہ پوش لڑکی سے وابستہ ہو گیا ہے جو اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور سارا وقت اپنی ٹانگ ہلاتی رہی تھی۔ پردے پر جب سائے کم اور روشنی زیادہ ہوئی تو اخلاق نے اس لڑکی کو ایک نظر دیکھا، اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے تھے۔ ناک کی پھننگ پہ چند بوندیں

تھیں جب اخلاق نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی ٹانگ ہلنا بند ہو گئی۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنے سیاہ برقعے کی جالی سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ یہ حرکت کچھ ایسی تھی کہ اخلاق کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

اس لڑکی نے اپنی سہیلی کے کان میں کچھ کہا۔ دونوں ہولے ہولے ہنسیں۔ اسکے بعد اس لڑکی نے نقاب اپنے چہرے سے ہٹالی۔ اخلاق کی طرف تیکھی تیکھی نظروں سے دیکھا اور ٹانگ ہلا کر فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔

اخلاق سگریٹ پی رہا تھا۔ انگرڈ برگ مین اس کی محبوب ایکٹرس تھی۔ فور ہوم دی بل ٹولز میں اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ فلم کے آغاز میں جب اخلاق نے اسے دیکھا تو وہ بہت ہی پیاری معلوم ہوئی۔ لیکن ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی دیکھنے کے بعد وہ انگرڈ برگ مین کو بھول گیا۔ یوں تو قریب قریب سارا فلم اسکی نگاہوں کے سامنے چلا مگر اس نے بہت ہی کم دیکھا۔

سارا وقت وہ لڑکی اس کے دل و دماغ پر چھائی رہی۔

اخلاق سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔۔ ایک مرتبہ اس نے راکھ جھاڑی تو اس کا سگریٹ انگلیوں سے نکل کر اس لڑکی کی گود میں جا پڑا۔۔ لڑکی فلم دیکھنے میں مشغول تھی۔ اس لئے اس کو سگریٹ گرنے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ اخلاق بہت گھبرایا۔ اسی گھبراہٹ میں اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ اس کے برقعے پر سے اٹھایا اور فرش پر پھینک دیا۔ لڑکی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اخلاق نے فوراً

کہا "معافی چاہتا ہوں آپ پر سگریٹ گر گیا تھا۔"

لڑکی نے تیکھی تیکھی نظروں سے اخلاق کی طرف دیکھا اور بیٹھ گئی۔ بیٹھ کر اس نے اپنی سہیلی سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ دونوں ہولے ہولے ہنسیں اور فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئیں۔

فلم کے اختتام پر جب قائداعظم کی تصویر نمودار ہوئی تو اخلاق اٹھا۔ خدا معلوم کیا ہوا کہ اس کا پاؤں اس لڑکی کے پاؤں کے ساتھ ٹکرایا۔ اخلاق ایک بار پھر سرتا پا معذرت بن گیا "معافی چاہتا ہوں۔ جانے آج کیا ہو گیا ہے۔"

دونوں سہیلیاں ہنستے ہوئے ہنسیں۔ جب بھیڑ کے ساتھ باہر نکلیں تو اخلاق ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ لڑکی جس سے اس کو پہلی نظر کا عشق ہوا تھا مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ اخلاق نے اس کی پرواہ نہ کی اور ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکی کا مکان دیکھ کے رہے گا۔

مال روڈ کے فٹ پاتھ پر وائی ایم سی اے کے سامنے اس لڑکی نے مڑ کر اخلاق کی طرف دیکھا اور اپنی سہیلی کا ہاتھ پکڑ کر رک گئی۔ اخلاق نے آگے نکلنا چاہا۔ تو وہ لڑکی اس سے مخاطب ہوئی "آپ ہمارے پیچھے پیچھے کیوں آرہے ہیں؟"

اخلاق نے ایک لحظہ سوچ کر جواب دیا "آپ میرے آگے آگے کیوں جا رہی ہیں۔"

لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے بعد اس نے اپنی سہیلی سے کچھ کہا پھر

دونوں چل پڑیں۔ بس اسٹینڈ کے پاس اس لڑکی نے جب مڑ کر دیکھا تو اخلاق نے کہا "آپ پیچھے آجایئے، میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔"

لڑکی نے منہ موڑ لیا۔

انارکلی کا موڑ آیا تو دونوں سہیلیاں ٹھہر گئیں۔ اخلاق پاس سے گزرنے لگا تو اس لڑکی نے اس سے کہا "آپ ہمارے پیچھے نہ آیئے۔ یہ بہت بری بات ہے۔"

لہجے میں بہت سنجیدگی تھی۔ اخلاق نے "بہت بہتر" کہا اور واپس چل دیا اس نے مڑ کر بھی ان کو نہ دیکھا، لیکن دل میں اس کو افسوس تھا کہ وہ کیوں اسکے پیچھے نہ گیا۔ اتنی دیر کے بعد اس کو اتنی شدت سے محسوس ہوا تھا کہ اس کو کسی سے محبت ہوئی ہے لیکن اس نے موقعہ ہاتھ سے جانے دیا۔ اب خدا معلوم پھر اس لڑکی سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔

جب وائی ایم سی اے کے پاس پہنچا تو رک کر اس نے انارکلی کے موڑ کیطرف دیکھا، مگر اب وہاں کیا تھا۔ وہ تو اسی وقت انارکلی کی طرف چلی گئی تھی۔

لڑکی کے نقش بڑے پتلے پتلے تھے۔ باریک ناک۔ چھوٹی سی ٹھوڑی پھول کی پتیوں جیسے ہونٹ — جب پردے پر سائے کم اور روشنی زیادہ ہوتی تھی تو اس نے اس کے بالائی ہونٹ پر ایک تل دیکھا تھا جو بے حد پیارا لگتا تھا۔ اخلاق نے سوچا تھا کہ اگر یہ تل نہ ہوتا تو شاید وہ لڑکی نامکمل رہتی۔

اس کا وہاں پر ہونا اشد ضروری تھا۔

چھوٹے چھوٹے قدم تھے۔ جن میں کنوارپن تھا چونکہ اس کو معلوم تھا کہ ایک مرد میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اس لئے ان کے ان چھوٹے چھوٹے قدموں میں ایک بڑی پیاری لڑکھڑاہٹ سی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا مڑ مڑ کر تو دیکھنا غضب تھا گردن کو ایک خفیف سا جھٹکا دیکر وہ پیچھے اخلاق کی طرف دیکھتی اور تیزی سے موڑ لیتی۔

دوسرے روز وہ انگرڈ برگ مین کا فلم پھر دیکھنے گیا۔ شو شروع ہو چکا تھا والٹ ڈزنی کا کارٹون چل رہا تھا کہ وہ اندر ہال میں داخل ہوا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ گیٹ کیپر کی بیٹری کی اندھی روشنی کے سہارے اس نے ٹٹول ٹٹول کر ایک خالی سیٹ تلاش کی اور اس پر بیٹھ گیا۔

ڈزنی کا کارٹون بہت مزاحیہ تھا۔ ادھر ادھر کئی تماشائی ہنس رہے تھے دفعتہً بہت ہی قریب سے اخلاق کو ایسی ہنسی سنائی دی جس کو وہ پہچانتا تھا۔ مڑ کر اس نے پیچھے دیکھا تو وہی لڑکی بیٹھی تھی۔

اخلاق کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لڑکی کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بیٹھا تھا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ اس کا بھائی لگتا تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ کس طرح بار بار مڑ کر دیکھ سکتا تھا۔

انٹرول ہو گیا۔ اخلاق کوشش کے باوجود فلم اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ روشنی ہوئی تو وہ اٹھا۔ لڑکی کے چہرے پہ نقاب تھا۔ مگر اس مہین پردے کے پیچھے اس کی

آنکھیں اخلاق کو نظر آئیں جن میں مسکراہٹ کی چمک تھی۔

لڑکی کے بھائی نے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اخلاق نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس سے مخاطب ہوا" ذرا ماچس عنائت فرمائیں۔"

لڑکی کے بھائی نے اس کو ماچس دیدی۔ اخلاق نے اپنا سگریٹ سلگایا۔ اور ماچس اس کو واپس دیدی۔" شکریہ!"

لڑکی کی ٹانگ ہل رہی تھی۔ اخلاق اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فلم کا بقایا حصہ شروع ہوا۔ ایک دو مرتبہ اس نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کرسکا۔

فلم ختم ہوا۔ لوگ باہر نکلنے شروع ہوئے۔ لڑکی اور اس کا بھائی ساتھ ساتھ تھے اخلاق ان سے ہٹ کر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

اسٹینڈ کے پاس بھائی نے اپنی بہن سے کچھ کہا، ایک ٹانگے والے کو بلایا۔ لڑکی اس میں بیٹھ گئی۔ لڑکا اسٹینڈرڈ میں چلا گیا۔ لڑکی نے نقاب میں سے اخلاق کی طرف دیکھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ٹانگہ چل پڑا۔ اسٹینڈرڈ کے باہر اسکے تین چار دوست کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کی سائیکل اس نے جلدی جلدی پکڑی اور ٹانگے کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔

یہ تعاقب بڑا دلچسپ تھا۔ زور کی ہوا چل رہی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر سے نقاب اُٹھ اُٹھ جاتی۔ سیاہ جارجٹ کا پردہ پھڑپھڑا پھڑپھڑا کر اس کے سفید چہرے کی جھلکیاں

رکھا تھا۔ کانوں میں سونے کے بڑے بڑے جھومر تھے۔ نچلے پتلے ہونٹوں پر سیاہی مائل سرخی تھی ۔ اور بالائی ہونٹ پر تل ۔ اور راشد ضروری تل ۔

بڑے زور کا جھونکا آیا تو اخلاق کے سر پر سے ہیٹ اتر گیا، اور سڑک پر دوڑنے لگا۔ ایک ٹرک گزر رہا تھا۔ اس کے وزنی پہیئے کے نیچے آیا اور وہیں چت ہو گیا۔ لڑکی ہنسی اخلاق مسکرایا۔ گردن موڑ کر ہیٹ کی لاش دیکھی جو بہت پیچھے رہ گئی تھی اور لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا "اس کو تو شہادت کا رتبہ مل گیا۔

لڑکی نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

اخلاق تھوڑی دیر کے بعد پھر اس سے مخاطب ہوا "آپ کو اعتراض ہے تو واپس چلا جاتا ہوں۔"

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔

انارکلی کی ایک گلی میں ٹانگہ رکا اور وہ لڑکی اتر کر اخلاق کی طرف بار بار دیکھتی نقاب اٹھا کر ایک مکان میں داخل ہو گئی۔ اخلاق ایک پاؤں سائیکل کے پیڈل پر اور دوسرا پاؤں دکان کے تھڑے پر رکھے تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ سائیکل چلانے ہی والا تھا۔ کہ اس مکان کی پہلی منزل پر ایک کھڑکی کھلی۔ لڑکی نے جھانک کر اخلاق کو دیکھا مگر فوراً ہی شرما کر پیچھے ہٹ گئی۔ اخلاق تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں کھڑا رہا مگر وہ پھر کھڑکی میں نمودار نہ ہوئی۔

دوسرے روز اخلاق صبح سویرے انارکلی کی اس گلی میں پہنچا۔ پندرہ بیس منٹ

تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ کھڑکی بند تھی۔ مایوس ہو کر لوٹنے والا تھا کہ ایک فالسے بیچنے والا صدا لگاتا آیا۔ کھڑکی کھلی، لڑکی سر سے ننگی نمودار ہوئی۔ اس نے فالسے والے کو آواز دی۔

"بھائی فالسے والے ذرا ٹھہرنا" پھر اس کی نگاہیں ایک دم اخلاق پر پڑیں، چونک کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ فالسے والے نے سر پر سے چھابڑی اتاری اور بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکی سر پر دوپٹہ لئے نیچے آئی۔ اخلاق کو اس نے کنکھیوں سے دیکھا۔ شرمائی اور فالسے لئے بغیر واپس چلی گئی۔

اخلاق کو یہ ادا بہت پسند آئی۔ تھوڑا سا ترس بھی آیا۔ فالسے والے نے جب اس کو گھور کے دیکھا تو وہ وہاں سے چل دیا۔ "چلو آج اتنا ہی کافی ہے۔"

چند دن ہی میں اخلاق اور اس لڑکی میں اشارے شروع ہو گئے۔ ہر روز صبح نو بجے وہ انارکلی کی اس گلی میں پہنچتا۔ کھڑکی کھلتی، وہ سلام کرتا وہ جواب دیتی، مسکراتی، ہاتھ کے اشاروں سے کچھ باتیں ہوتیں۔ اس کے بعد وہ چلی جاتی۔

ایک روز انگلیاں گھما کر اس نے اخلاق کو بتایا کہ وہ شام کے چھ بجے کے شو سینما دیکھنے جا رہی ہے۔ اخلاق نے اشاروں کے ذریعہ اسے پوچھا۔ "کون سے سینما ہاؤس میں"

اس نے جواب میں کچھ اشارے کئے مگر اخلاق نہ سمجھا۔ آخر میں اس نے اشاروں میں کہا۔ "کاغذ پر لکھ کر نیچے پھینک دو۔"

لڑکی کھڑکی سے ہٹ گئی۔ چند لمحات کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کاغذ کی ایک مڑوڑی سی نیچے پھینک دی۔ اخلاق نے اسے کھولا۔ لکھا تھا۔

"پلازا — پروین"

شام کو پلازا میں اس کی ملاقات پروین سے ہوئی۔ اس کے ساتھ اسکی سہیلی تھی اخلاق اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فلم شروع ہوا تو پروین نے نقاب اٹھالیا۔ اخلاق سارا وقت اس کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل دھک دھک کرتا تھا۔ انٹرول سے کچھ پہلے اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ کانپ اٹھی۔ اخلاق نے فوراً ہاتھ اٹھا لیا۔ دراصل وہ اس کو انگوٹھی دینا چاہتا تھا بلکہ خود پہنانا چاہتا تھا جو اس نے اسی روز خریدی تھی۔ انٹرول ختم ہوا تو اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اسکے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ کانپی۔ لیکن اخلاق نے ہاتھ نہ ہٹایا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے انگوٹھی نکالی اور اس کی ایک انگلی میں چڑھا دی۔ وہ بالکل خاموش رہی۔ اخلاق نے اس کی طرف دیکھا، پیشانی اور ناک پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے تھرتھرا رہے تھے۔

فلم ختم ہوا تو اخلاق اور پروین کی یہ ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ باہر نکل کر کوئی بات نہ ہو سکی۔ دونوں سہیلیاں ٹانگے میں بیٹھیں۔ اخلاق کو دوست مل گئے، انہوں نے اسے روک لیا۔ لیکن وہ بہت خوش تھا اسلئے کہ پروین نے اس کا تحفہ قبول کر لیا تھا۔

دوسرے روز مقررہ اوقات پر جب اخلاق پروین کے گھر کے پاس پہنچا تو کھڑکی کھلی تھی۔ اخلاق نے سلام کیا، پروین نے جواب دیا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلی میں اس کی پہنائی ہوئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

تھوڑی دیر اشارے ہوتے رہے اسکے بعد پروین نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لفافہ نیچے

پھینک دیا۔ اخلاق نے اٹھایا، کھولا تو اس میں ایک خط تھا، انگوٹھی کے شکریے کا۔

گھر پہنچ کر اخلاق نے ایک طویل جواب لکھا، اپنا دل نکال کر کاغذوں پر رکھ دیا اس خط کو اس نے پھول دار لفافے میں بند کیا، اس پر سینٹ لگایا اور دوسرے روز صبح نو بجے پروین کو دکھا کر نیچے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

اب ان میں باقاعدہ خط و کتابت شروع ہو گئی، ہر خط عشق و محبت کا ایک دفتر تھا، ایک خط اخلاق نے اپنے خون سے لکھا جس میں اس نے قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ اپنی محبت میں ثابت قدم رہیگا۔ اسکے جواب میں خونی تحریر ہی آئی، پروین نے بھی حلف اٹھایا کہ وہ مر جائے گی لیکن اخلاق کے سوا اور کسی کو شریک حیات نہیں بنائے گی۔

مہینوں گزر گئے، اس دوران میں کبھی کبھی سینما میں دونوں کی ملاقات ہو جاتی تھی، مل کر بیٹھنے کا موقعہ انہیں نہیں ملتا تھا، پروین پر گھر کی طرف سے . . . بہت کڑی پابندیاں عاید تھیں۔ وہ باہر نکلتی تھی یا تو اپنے بھائی کے ساتھ یا اپنی سہیلی زہرہ کے ساتھ، ان دو کے علاوہ اس کو اور کسی کے ساتھ باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اخلاق نے اسے کئی مرتبہ لکھا کہ زہرہ کے ساتھ وہ کبھی اسے بارہ دری میں یا جہانگیر کے مقبرے میں ملے، مگر وہ نہ مانی۔ اس کو ڈر تھا کہ کوئی دیکھ لے گا۔

اس اثنا میں اخلاق کے والدین نے اسکی شادی کی بات چیت شروع کر دی۔ اخلاق ٹالتا رہا، جب انہوں نے تنگ آکر ایک جگہ بات کر دی تو اخلاق بگڑ گیا، بہت ہنگامہ ہوا، یہاں تک کہ اخلاق کو گھر سے نکل کر ایک رات اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں سونا پڑا۔ ادھر پروین

روتی رہی، کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

اخلاق دھن کا بہت پکا تھا۔ ضدی بھی پرلے درجے کا تھا۔ گھر سے باہر قدم نکالا تو پھر ادھر رُخ تک نہ کیا۔ اسکے والد نے اس کو بہت سمجھایا بجھایا مگر وہ نہ مانا۔ ایک دفتر میں سو روپے ماہوار پر نوکری کرلی اور ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگا، جس میں نل تھا نہ بجلی۔

اُدھر پروین اخلاق کی تکلیفوں کے دکھ میں گھل رہی تھی۔ گھر میں جب اچانک اس کی شادی کی بات چیت شروع ہوئی تو اس پر بجلی سی گری۔ اس نے اخلاق کو لکھا وہ بہت پریشان ہے۔ لیکن پروین کو اس نے تسلی دی کہ وہ گھبرائے نہیں ثابت قدم رہے عشق ان کا امتحان لے رہا ہے۔

بارہ دن گزر گئے۔ اخلاق کئی بار گیا۔ مگر پروین کھڑکی میں نظر نہ آئی۔ وہ صبر و قرار کھو بیٹھا۔ نیند اس کی غائب ہوگئی۔ اس نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ زیادہ ناغے ہوئے تو اس کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ برطرفی کا نوٹس ملا تو وہ سیدھا پروین کے مکان کی طرف چل پڑا۔ پندرہ دنوں کے طویل عرصے کے بعد اسے پروین نظر آئی۔ وہ بھی ایک لحظے کے لئے۔ جلدی سے لفافہ پھینک کر وہ چلی گئی۔

خط بہت طویل تھا۔ پروین کی غیر حاضری کا باعث یہ تھا کہ اس کا باپ اسکو اپنے ساتھ گوجرانوالہ لے گیا تھا جہاں اسکی بڑی بہن رہتی تھی۔ پندرہ دن وہ خون کے آنسو روتی رہی۔ اس کا جہیز تیار کیا جا رہا تھا اس کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے لئے نہ نگ برنگے کفن

بن رہے ہیں خط کے آخر میں یہ لکھا تھا۔ تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ میری موت کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ میں مر جاؤں گی۔ میں ضرور کچھ کھا کے مر جاؤں گی۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ نہیں نہیں ایک اور راستہ بھی ہے۔ لیکن میں کیا اتنی ہمت کر سکوں گی۔ تم بھی اتنی ہمت کر سکو گے۔ . . . . میں تمہارے پاس چلی آؤں گی۔ مجھے تمہارے پاس آنا ہی پڑیگا۔ تم نے میرے لئے گھر بار چھوڑا۔ میں تمہارے لئے یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی، جہاں میری موت کے سامان ہو رہے ہیں۔ لیکن میں بیوی بنکر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تم شادی کا بندوبست کر لو۔ میں صرف تین کپڑوں میں آؤنگی زیور وغیرہ اتار کر یہاں پھینک دوں گی۔

— جواب جلدی دو، ہمیشہ تمہاری۔ پروین۔

اخلاق نے کچھ نہ سوچا، فوراً اس کو لکھا "میری باہیں تمہیں اپنے آغوش میں لینے کیلئے تڑپ رہی ہیں۔ میں تمہاری عزت و عصمت پہ کوئی حرف نہیں آنے دونگا۔ تم میری رفیقۂ حیات بن کے رہو گی۔ زندگی بھر میں تمہیں خوش رکھونگا۔"

ایک دو خط اور لکھے گئے اس کے بعد طے کیا گیا کہ پروین بدھ کو صبح سویرے گھر سے نکلے گی۔ اخلاق ٹانگہ لے کر گلی کے نکڑ پر اسکا انتظار کرے۔

بدھ کو منہ اندھیرے اخلاق ٹانگے میں وہاں پہنچ کر پروین کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ اخلاق کا اضطراب بڑھ گیا۔ لیکن وہ آگئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، وہ گلی میں نمودار ہوئی، چال میں لڑکھڑاہٹ تھی جب وہ ٹانگے میں اخلاق

کے ساتھ بیٹھی تو سر تا پا کانپ رہی تھی، اخلاق خود بھی کانپنے لگا۔

گھر پہنچے تو اخلاق نے بڑے پیار سے اس کے برقعے کی نقاب اٹھائی۔ اور کہا ”میری دولہن کب تک مجھ سے پردہ کرے گی۔“

پروین نے شرما کر آنکھیں جھکالیں۔ اس کا رنگ زرد تھا جسم ابھی تک کانپ رہا تھا۔ اخلاق نے بالائی ہونٹ کے تل کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں میں ایک بوسہ تڑپنے لگا۔ اسکے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس نے تل والی جگہ کو چوما۔ پروین نے نہ نہ کی۔ اسکے ہونٹ کھلے۔ دانتوں میں گوشت خورہ تھا۔ مسوڑھے گہرے نیلے رنگ کے تھے۔ گلے ہوئے سڑاند کا ایک بھبکا اخلاق کی ناک میں گھس گیا۔ ایک دھکا سا اس کو لگا۔ ایک اور بھبکا پروین کے منہ سے نکلا تو وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

پروین نے دبی آواز میں کہا۔ شادی سے پہلے آپ کو ایسی باتوں کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے گلے ہوئے مسوڑھے نمایاں ہوئے اخلاق کے ہوش و حواس غائب تھے۔ دماغ سن ہو گیا تھا۔ دیر تک وہ دونوں پاس پاس بیٹھے رہے۔ اخلاق کو کوئی بات نہیں سوجھتی تھی۔ پروین کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جب اس نے انگلی کا ناخن کاٹنے کیلئے ہونٹ کھولے تو پھر ان گلے ہوئے مسوڑوں کی نمائش ہوئی۔ بو کا ایک بھبکا نکلا۔ اخلاق کو متلی آنے لگی اٹھا اور ”ابھی آیا“ کہہ کر باہر نکل گیا۔ ایک تھڑے پر بیٹھ کر اس نے بہت دیر سوچا جب کچھ سمجھ میں نہ آیا فوراً ٹیلپور روانہ ہو گیا۔ جہاں اسکا ایک دوست رہتا تھا۔ اخلاق نے سارا واقعہ سنایا تو اس نے بہت لعن طعن کی اور

اس سے کہا۔ فوراً واپس جاؤ۔ کہیں بے چاری خود کشی نہ کرلے۔"

اخلاق رات کو واپس لاہور آیا۔ گھر میں داخل ہوا، تو پروین موجود نہیں تھی۔ پلنگ پر تکیہ پڑا تھا۔ اس پر دو گول گول نشان تھے۔ گیلے!

اس کے بعد اخلاق کو پروین کہیں نظر نہ آئی۔

۵، جون ۱۹۵۰ء

کُتّے کی دُعا

"آپ یقین نہیں کریں گے۔ مگر یہ واقعہ جو میں آپ کو سنانے والا ہوں۔ بالکل صحیح ہے۔" یہ کہہ کر شیخ صاحب نے بیڑی سلگائی۔ دو تین زور کے کش لے کر اسے پھینک دیا۔ اور اپنی داستان سنانا شروع کی۔ شیخ صاحب کے مزاج سے ہم واقف تھے، اس لئے ہم خاموشی سے سنتے رہے۔ درمیان میں ان کو کہیں بھی نہ ٹوکا۔

آپ نے واقعہ یوں بیان کرنا شروع کیا۔ "گولڈی میرے پاس پندرہ برس سے تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کا رنگ سنہری مائل بھوسلا تھا۔ بہت ہی حسین کتا تھا۔ جب میں صبح اس کے ساتھ باغ کی سیر کو نکلتا تو لوگ اس کو دیکھنے کیلئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لارنس گارڈن کے باہر میں اسے کھلا کر دیتا۔" گولڈی

کھڑے رہنا یہاں — میں ابھی آتا ہوں"۔ یہ کہہ کر میں باغ کے اندر چلا جاتا۔ گھوم پھر کر آدھے گھنٹے کے بعد واپس آتا تو گولڈی وہیں اپنے لمبے لمبے کان لٹکائے کھڑا ہوتا۔

اسپیشل ذات کے کتے عام طور پر بڑے اطاعت گزار اور فرمانبردار ہوتے ہیں، مگر میرے گولڈی میں یہ صفات بہت نمایاں تھیں۔ جب تک اسکو اپنے ہاتھ سے کھانا نہ دوں، نہیں کھاتا تھا۔ دوست یاروں نے میرا مان توڑنے کیلئے لاکھوں جتن کئے، مگر گولڈی نے ان کے ہاتھ سے ایک دانہ تک نہ کھایا۔

ایک روز اتفاق کی بات ہے میں لارنس کے باہر اسے چھوڑ کر اندر گیا تو ایک دوست مل گیا۔ گھومتے گھامتے کافی دیر ہوگئی، اس کے بعد وہ مجھے اپنی کوٹھی لے گیا۔ مجھے شطرنج کھیلنے کا مرض تھا۔ بازی شروع ہوئی تو میں دنیا و مافیہا بھول گیا۔ کئی گھنٹے بیت گئے۔ دفعتہً مجھے گولڈی کا خیال آیا، بازی چھوڑ، لارنس کے گیٹ کی طرف بھاگا۔ گولڈی وہیں اپنے لمبے لمبے کان لٹکائے کھڑا تھا۔ مجھے اس نے عجیب نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہے، "دوست، تم نے آج اچھا سلوک کیا مجھ سے۔"

میں بے حد نادم ہوا، چنانچہ آپ یقین جانیں، میں نے شطرنج کھیلنا چھوڑ دی۔ معاف کیجئے گا، میں اصل واقعے کی طرف ابھی تک نہیں آیا۔ دراصل گولڈی کی بات شروع ہوئی تو میں چاہتا ہوں کہ اس کے متعلق مجھے جتنی باتیں یاد ہیں آپکو سنا دوں مجھے اس سے بے حد محبت تھی، میرے مجرد رہنے کا ایک باعث اس کی محبت بھی تھی۔

جب میں نے شادی نہ کرنے کا تہیہ کیا تو اس کو خصی کرا دیا ۔ آپ شاید کہیں کہ میں نے ظلم کیا، لیکن میں سمجھتا ہوں، محبت میں ہر چیز روا ہے ۔ میں اس کی ذات کے ساتھ اور کسی کو وابستہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

کئی بار میں نے سوچا اگر میں مر گیا تو یہ کسی اور کے پاس چلا جائے گا۔ کچھ دیر میری موت کا اثر اس پر رہے گا۔ اس کے بعد مجھے بھول کر اپنے نئے آقا سے محبت کرنا شروع کر دے گا۔ جب میں یہ سوچتا تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔ لیکن میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا، کہ اگر مجھے اپنی موت کی آمد کا پورا یقین ہو گیا تو میں گولڈی کو ہلاک کر دوں گا۔ آنکھیں بند کر کے اسے گولی کا نشانہ بنا دوں گا۔

گولڈی کبھی ایک لمحے کے لئے مجھ سے جدا نہیں ہوا تھا۔ رات کو ہمیشہ میرے ساتھ سوتا۔ میری تنہا زندگی میں وہ ایک روشنی تھی۔ میری بے حد پھیکی زندگی میں اس کا وجود ایک شیرینی تھا۔ اس سے میری غیر معمولی محبت دیکھ کر کئی دوست مذاق اڑاتے تھے۔ "شیخ صاحب گولڈی کتیا ہوتی تو آپ نے ضرور اس سے شادی کر لی ہوتی" ایسے ہی کئی اور بھی فقرے کسے جاتے، لیکن میں مسکرا دیتا۔ گولڈی بڑا ذہین تھا۔ اس کے متعلق جب کوئی بات ہوتی تو فوراً اس کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ میرے ہلکے سے ہلکے اشارے کو بھی وہ سمجھ لیتا تھا۔ میرے موڈ کے سارے اتار چڑھاؤ اسے معلوم ہوتے ہیں اگر کسی وجہ سے رنجیدہ ہوتا تو وہ میرے ساتھ چہلیں شروع کر دیتا۔ مجھے خوش کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا۔

ابھی اس نے ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنا نہیں سیکھا تھا یعنی ابھی کم سن تھا کہ اس نے ایک برتن کو جو کہ خالی تھا تھوتھنی بڑھا کر سونگھا، میں نے اسے جھڑکا تو دم دبا کر وہیں بیٹھ گیا۔ پہلے اس کے چہرے پر حیرت سی پیدا ہوئی تھی کہ ہیں یہ مجھ سے کیا ہو گیا، دیر تک گردن نیوڑھائے بیٹھا رہا۔ جیسے ندامت کے سمندر میں غرق ہے۔ میں اٹھا۔ اٹھ کر اس کو اپنی گود میں لیا، پیار پچکارا۔ بڑی دیر کے بعد جا کر اس کی دم ہلی۔ مجھے بہت ترس آیا کہ میں نے خواہ مخواہ اسے ڈانٹا، کیوں کہ اس روز رات کو غریب نے کھانے کو منہ نہ لگایا، وہ بڑا احساس کتا تھا۔

میں بہت بے پروا آدمی ہوں۔ میری غفلت سے اس کو ایک بار نمونیہ ہو گیا میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ڈاکٹروں کے پاس دوڑا، علاج شروع ہوا۔ مگر اثر ندارد متواتر سات راتیں جاگتا رہا۔ اس کو بہت تکلیف تھی، سانس بڑی مشکل سے آتا تھا، جب سینے میں درد اٹھتا تو وہ میری طرف دیکھتا۔ جیسے یہ کہہ رہا ہے "فکر کی کوئی بات نہیں، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

کئی بار میں نے محسوس کیا کہ صرف میرے آرام کی خاطر اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی تکلیف کچھ کم ہے وہ آنکھیں میچ لیتا، تاکہ میں تھوڑی دیر آنکھ لگا لوں۔

آٹھویں روز خدا خدا کر کے اس کا بخار ہلکا ہوا، اور آہستہ آہستہ اتر گیا۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو مجھے ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ اسکی آنکھوں میں

تیرتی نظر آئی۔

ٹمو نیبے کے ظالم حملے کے بعد دیر تک اس کو نقاہت رہی، لیکن طاقت ور دواؤں نے اسے ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ ایک لمبی غیر حاضری کے بعد لوگوں نے مجھے اس کے ساتھ دیکھا تو طرح طرح کے سوال کرنے شروع کئے۔ "عاشق و معشوق کہاں غائب تھے اتنے دنوں۔"

"آپس میں کہیں لڑائی تو نہیں ہو گئی تھی۔"

"کسی اور سے تو نظر نہیں لڑ گئی تھی گولڈی کی۔"

میں خاموش رہا۔ گولڈی یہ باتیں سنتا تو ایک نظر میری طرف دیکھ کر خاموش ہو جاتا کہ "بھونکنے دو کتوں کو۔"

وہ مثل مشہور ہے۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ کبوتر بہ کبوتر باز بہ باز۔ لیکن گولڈی کو ہم اپنے ہم جنسوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دنیا صرف میری ذات تھی۔ اس سے باہر وہ کبھی نکلتا ہی نہیں تھا۔

گولڈی میرے پاس نہیں تھا جب ایک دوست نے مجھے اخبار پڑھکر سنایا اس میں ایک واقعہ لکھا تھا۔ آپ سنئے بڑا دلچسپ ہے۔ امریکہ یا انگلستان مجھے یاد نہیں کہاں۔ ایک شخص کے پاس کتا تھا معلوم نہیں کس ذات کا۔ اس شخص کا اپریشن ہونا تھا۔ اس کو ہسپتال لے گئے تو کتا بھی ساتھ ہو لیا۔ اسٹریچر پر ڈال کر اس کو اپریشن روم میں لے جانے لگے تو کتے نے اندر جانا چاہا۔ مالک نے اس کو روکا اور کہا، باہر کھڑے رہو۔

میں ابھی آتا ہوں ــ کتا حکم سن کر باہر کھڑا ہو گیا۔ اندر مالک کا آپریشن ہوا، جو ناکام ثابت ہوا ــ اس کی لاش دوسرے دروازے سے باہر نکال دی گئی ــ کتا بارہ برس تک وہیں کھڑا اپنے مالک کا انتظار کرتا رہا ــ پیشاب پاخانے کے لئے کچھ دیر وہاں سے ہٹتا ــ پھر وہیں کھڑا ہو جاتا۔ آخر ایک روز موٹر کی لپیٹ میں آگیا اور بڑی طرح زخمی ہوا، مگر اس حالت میں بھی وہ خود کو گھسیٹتا ہوا وہاں پہنچا جہاں اس کے مالک نے اسے انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ آخری سانس اس نے اسی جگہ لیا ــ یہ بھی لکھا تھا کہ ہسپتال والوں نے اس کی لاش میں بھس بھر کے اس کو وہیں رکھ دیا ہے۔ جیسے وہ اب بھی آقا کے انتظار میں کھڑا ہے۔

میں نے یہ داستان سنی تو مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اول تو مجھے اس کی صحت ہی کا یقین نہ آیا، لیکن جب گولڈی میرے پاس آیا اور مجھے اس کی صفات کا علم ہوا تو بہت برسوں کے بعد میں نے یہ داستان کئی دوستوں کو سنائی۔ سناتے وقت مجھ پر ایک رقت طاری ہو جاتی تھی اور میں سوچنے لگتا تھا "میرے گولڈی سے بھی کوئی ایسا کارنامہ وابستہ ہونا چاہیئے ــ گولڈی معمولی ہستی نہیں ہے۔"

گولڈی بہت متین اور سنجیدہ تھا، بچپن میں اس نے تھوڑی شرارتیں کیں مگر جب اس نے دیکھا کہ مجھے پسند نہیں تو ان کو ترک کر دیا، آہستہ آہستہ سنجید گی

اختیار کر لی جو تا دمِ مرگ رہی۔

"میں نے تا دمِ مرگ کہا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔"

شیخ صاحب رک گئے ان کی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں ہم خاموش رہے تھوڑے عرصے کے بعد انہوں نے رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھے اور کہنا شروع کیا۔

"یہ میری زیادتی ہے کہ میں زندہ ہوں . . . لیکن شاید اس لئے زندہ ہوں کہ انسان ہوں . . . مر جانا تو شاید گولڈی کی توہین ہوتی . . . جب وہ مرا تو رو رو کر میرا برا حال تھا — لیکن وہ مرا نہیں تھا، میں نے اس کو مروا دیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے اپنی موت کی آمد کا یقین ہو گیا تھا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا، ایسا پاگل نہیں جیسا کہ عام پاگل کتے ہوتے ہیں، اس کے مرض کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا، اس کو سخت تکلیف تھی، جانکنی کا سا عالم اس پر طاری تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا، اس کا واحد علاج یہی ہے کہ اس کو مروا دو۔ میں نے پہلے سوچا نہیں لیکن وہ جس اذیت میں گرفتار تھا، مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی، میں مان گیا، وہ اسے ایک کمرے میں لے گئے، جہاں برقی جھٹکا پہنچا کر ہلاک کرنیوالی مشین تھی، میں ابھی اپنے نحیف دماغ میں اچھی طرح کچھ سوچ بھی نہ سکا تھا، کہ وہ اس کی لاش لے آئے — میری گولڈی کی لاش، جب میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا تو میرے آنسو ٹپ ٹپ اس کے سنہری بالوں پر گرنے لگے جو پہلے

کبھی گرد آلود نہیں ہوئے تھے — ٹانگے میں اسے گھر لایا، دیر تک اس کو دیکھا کیا۔ پندرہ سال کی رفاقت کی لاش میرے بستر پر پڑی تھی — قربانی کا مجسمہ ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اس کو نہلایا — کفن پہنایا، بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اب کیا کروں۔ زمین میں دفن کروں یا جلا دوں۔

زمین میں دفن کرتا تو اس کی موت کا ایک نشان رہ جاتا، یہ مجھے پسند نہیں تھا۔ معلوم نہیں کیوں، یہ بھی معلوم نہیں کہ میں نے کیوں اس کو غرق دریا کرنا چاہا۔ میں نے اس کے متعلق اب بھی کئی بار سوچا ہے مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ خیر میں نے ایک نئی بوری میں اس کی کفنائی ہوئی لاش ڈالی۔ دھو دھا کر بٹے اس میں ڈالے اور دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب بیڑی دریا کے درمیان میں پہنچی، اور میں نے بوری کی طرف دیکھا تو گولڈی سے پندرہ برس کی رفاقت و محبت ایک بہت ہی تیز تلخی بن کر میرے حلق میں اٹک گئی۔ میں نے اب زیادہ دیر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بوری اٹھائی اور دریا میں پھینک دی۔ بہتے ہوئے پانی کی چادر پر کچھ بلبلے اٹھے اور ہوا میں حل ہو گئے۔

بیڑی واپس ساحل پر آئی۔ میں اتر کر دیر تک اس طرف دیکھتا رہا جہاں میں نے گولڈی کو غرق آب کیا تھا۔ شام کو دھندلکا چھایا ہوا تھا، پانی بڑی خاموشی سے بہہ رہا تھا جیسے وہ گولڈی کو اپنی گود میں سلا رہا ہے۔"

یہ کہہ کر شیخ صاحب خاموش ہو گئے۔ چند لمحات کے بعد ہم میں سے ایک نے ان سے پوچھا۔ "لیکن شیخ صاحب آپ تو خاص واقعہ سنانے والے تھے۔"

شیخ صاحب چونکے۔ اوہ ـــ معاف کیجئے گا۔ میں اپنی رو میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ـــــــــ واقعہ یہ تھا کہ ـــــــــ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔

پندرہ برس ہو گئے تھے۔ ہماری رفاقت کو ـــ اس دوران میں کبھی بیمار نہیں ہوا تھا۔ میری صحت ماشاءاللہ بہت اچھی تھی ـــ لیکن جس دن میں نے گولڈی کی پندرھویں سالگرہ منائی ـــ اس کے دوسرے دن میں نے اعضاء شکنی محسوس کی۔ شام کو یہ اعضاء شکنی تیز بخار میں تبدیل ہو گئی ـــ رات سخت بے چین رہا ـــ گولڈی جاگتا رہا ـــ ایک آنکھ بند کرکے دوسری آنکھ سے مجھے دیکھتا رہا۔ پلنگ پر سے اتر کر نیچے جاتا پھر آکر بیٹھ جاتا۔

زیادہ عمر ہو جانے کے باعث اس کی بینائی اور سماعت کمزور ہو گئی تھی لیکن ذرا سی آہٹ ہوتی تو وہ چونک پڑتا اور اپنی دھندلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا اور جیسے یہ پوچھتا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں"

اس کو حیرت تھی کہ میں اتنی دیر تک پلنگ پر کیوں پڑا ہوں، لیکن وہ جلد ی

ہی ساری بات سمجھ گیا۔ جب مجھے بستر پر لیٹے کئی دن گزر گئے تو اس کے سال خوردہ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ میں اس کو اپنے ہاتھ سے کھلایا کرتا تھا۔ بیماری کے آغاز میں تو میں اس کو کھانا دیتا رہا۔ جب نقاہت بڑھ گئی۔ تو میں نے ایک دوست سے کہا۔ کہ وہ صبح شام گولڈی کو کھانا کھلانے آ جایا کرے ۔۔ وہ آتا رہا ۔ مگر گولڈی نے پلیٹ کی طرف منہ نہ کیا ۔ میں نے بہت کہا۔ لیکن وہ نہ مانا ۔ ایک مجھے اپنے مرض کی تکلیف تھی جو دور ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ دوسرے مجھے گولڈی کی فکر تھی۔ جس نے کھانا پینا بالکل بند کر دیا تھا۔

اب اس نے پلنگ پر بیٹھنا لیٹنا بھی چھوڑ دیا۔ سامنے دیوار کے پاس سارا دن اور ساری رات خاموش بیٹھا اپنی دھندلی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہتا اس سے مجھے اور بھی دکھ ہوا۔ وہ کبھی ننگی زمین پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے بہت کہا۔ لیکن وہ نہ مانا۔

وہ بہت زیادہ خاموش ہو گیا تھا ۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غم واندوہ میں غرق ہے ۔۔ کبھی کبھی اٹھ کر پلنگ کے پاس آتا۔ عجیب حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا۔ اور گردن جھکا کر واپس دیوار کے پاس چلا جاتا۔

ایک رات لیمپ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ گولڈی کی دھندلی آنکھوں میں

آنسو چمک رہے ہیں۔ اس کے چہرے سے حزن و ملال برس رہا تھا مجھے بہت دُکھ پہنچا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا لمبے لمبے سنہرے کان ہلاتا وہ میرے پاس آیا۔ میں نے بڑے پیار سے کہا "گولڈی میں اچھا ہو جاؤں گا۔ تم دعا مانگو۔ تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی۔"

یہ سن کر اس نے بڑی اداس آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر سر اوپر اُٹھا کر چھت کی طرف دیکھنے لگا جیسے دعا مانگ رہا ہے۔ کچھ دیر وہ اسطرح کھڑا رہا۔ میرے جسم پر جھر جھری سی طاری ہو گئی۔ ایک عجیب و غریب تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ گولڈی سچ مچ دعا مانگ رہا تھا۔ میں سچ عرض کرتا ہوں وہ سر تا پا دعا تھا۔ میں کہنا نہیں چاہتا۔ لیکن اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اسکی روح خدا کے حضور پہنچ کر گڑگڑا رہی ہے۔

میں چند ہی دنوں میں اچھا ہو گیا۔ لیکن گولڈی کی حالت غیر ہو گئی۔ جب تک میں بستر پر تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے دیوار کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا۔ میں ہلنے جلنے کے قابل ہوا تو میں نے اس کو کھلانے پلانے کی کوشش کی مگر بے سود، اس کو اب کسی شے سے دلچسپی نہیں تھی۔ دعا مانگنے کے بعد جیسے اسکی ساری طاقت زائل ہو گئی تھی۔

میں اس سے کہتا، میری طرف دیکھو گولڈی۔ میں اچھا ہو گیا ہوں۔ خدا نے تمہاری دعا قبول کر لی ہے۔ لیکن وہ آنکھیں نہ کھولتا۔ میں نے دو تین دفعہ

ڈاکٹر بلایا۔ اس نے انجکشن لگائے پر کچھ نہ ہوا۔ ایک دن میں ڈاکٹر لے کر آیا۔ تو اسکا دماغ چل چکا تھا۔

میں اٹھا کر اسے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا، اور اس کو برقی ضرب سے ہلاک کرا دیا۔

مجھے معلوم نہیں بابر اور ہمایوں والا قصہ کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن یہ واقعہ حرف بحرف درست ہے۔

۶/جون ۱۹۵۰ء

پری

کشمیری گیٹ دہلی کے ایک فلیٹ میں انور کی ملاقات پرویز سے ہوئی، وہ قطعاً متاثر نہ ہوا۔ پرویز نہایت ہی بے جان چیز تھی۔ انور نے جب اس کی طرف دیکھا اور اس کو آداب عرض کہا تو اس نے سوچا "یہ کیا ہے عورت ہے یا مولی؟"

پرویز اتنی سفید تھی کہ اس کی سفیدی بے جان سی ہو گئی تھی۔ جس طرح مولی ٹھنڈی ہوتی ہے اسی طرح اس کا سفید رنگ بھی ٹھنڈا تھا۔ کمر میں ہلکا سا خم تھا۔ جیسا کہ اکثر مولیوں میں ہوتا ہے۔ انور نے جب اس کو دیکھا تو اس نے سبز دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کو پرویز ہو بہو مولی نظر آئی جس کے ساتھ سبز پتے لگے ہوں۔

انور سے ہاتھ ملا کر پرویز اپنے ننھے سے کتے کو گود میں لے کر کرسی پر بیٹھ گئی اس کے سرخی لگے ہونٹوں پر جو اس کے سفید ٹھنڈے چہرے پر ایک دہکتا ہوا انگارہ سا لگتے تھے۔ ضعیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ کتے کے بالوں میں اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اس نے دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی انور کے دوست جمیل کی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

انور کو اس کے ساتھ مل کر قطعاً خوشی نہیں ہوئی تھی۔ رنج بھی نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ سوچتا تو یقینی طور پر اپنے صحیح ردِ عمل کو بیان نہ کر سکتا۔ دراصل پرویز سے مل کر وہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ ایک لڑکی سے ملا ہے یا اس کی ملاقات کسی لڑکے سے ہوئی ہے۔ یا سردیوں میں کرکٹ کے میچ دیکھتے ہوئے اس نے ایک مولی خرید لی ہے۔

انور نے اس کی طرف غور سے دیکھا، اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں لیکن ایک صرف یہی چیز تھی جس کے متعلق تعریفی الفاظ میں کچھ کہا جا سکتا تھا ان آنکھوں کے علاوہ پرویز کے جسم کے ہر حصے پر نکتہ چینی ہو سکتی تھی۔ باہیں بہت پتلی تھیں جو چھوٹی آستینوں والی قمیض میں سے بہت ہی بخ آلود انداز میں باہر کو نکلی ہوئی تھیں، اگر اس کے سر پر سبز دوپٹہ نہ ہوتا تو انور نے یقیناً اس کو فرجڈ یر سمجھا ہوتا۔ جس کا رنگ عام طور پر اکتا دینے والا سفید ہوتا ہے۔

اس کے ہونٹوں پر جیتے جیتے لہو جیسی سرخی بہت کھل رہی تھی۔ برف کے ساتھ آگ کا کیا جوڑ ؟ — اس کی چھوٹی آستینوں والی قمیض سفید کمرگ کی تھی، شلوار سفید لٹھے کی تھی۔ سینڈل بھی سفید تھے۔ اس کے تمام سفیدی پر اسکا سبز دوپٹہ اتنا انقلاب انگیز نہیں تھا۔ مگراس کے سرخی لگے ہونٹ ایک عجیب سا ہنگامہ خیز تضاد بن کراس کے چہرے کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔

صحن میں جب وہ چند قدم چل کر جمیل کی طرف اپنے ننھے سے کتے کو دیکھتی ہوئی بڑھی تھی۔ تو انور نے محسوس کیا تھا کہ یہ عورت جو کہ آ رہی ہے عورت نہیں شکاری ہے اس سے ہاتھ ملاتے وقت اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کا ہاتھ کسی لاش نے پکڑ لیا ہے۔ مگر جب اس نے باتیں شروع کی تو وہ ٹھنڈی گرفت جو اس کے ہاتھ کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی کچھ گرم ہونے لگی۔

وہ آوارہ خیال تھی۔ اس کی باتیں سب کی سب بے جوڑ تھیں۔ موسم کا ذکر کرتے کرتے وہ اپنے درزی کی طرف لڑھک گئی۔ درزی کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ اس کو اپنے کتے کی چھینکوں کا خیال آ گیا۔ کتے نے چھینکا تو اس نے اپنے خاوند کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیا ”وہ بالکل میرا خیال نہیں رکھتے، دیکھئے ابھی تک دفتر سے نہیں آئے۔“

انور کے لئے پرویز اور اس کا خاوند دونوں بالکل نئے تھے وہ پرویز کو جانتا تھا نہ اس کے خاوند کو۔ گفتگو کے دوران میں صرف اس کو اس قدر معلوم ہوا کہ

پرویز کا خاوند جمیل کا پڑوسی ہے اور ایکسپورٹ امپورٹ کا کام کرتا ہے البتہ اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ پرویز گفتگو کے آغاز سے گفتگو کے اختتام تک اس کو ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جن میں جنسی بلاوا تھا۔ انور کو حیرت تھی کہ ایک ٹھنڈی مولی میں یہ بلاوا کیسے ہو سکتا ہے۔

وہ اٹھ کر جانے لگی تو اس نے گود سے اپنے ننھے کتے کو اتارا اور اس سے کہا "ٹینی چلو چلیں" پھر مسز جمیل سے جیگروڈل کے بارے میں کچھ پوچھ کر اپنے سرخ ہونٹوں پر چھدری سی مسکراہٹ پیدا کر کے انور کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس نے کہا۔ "میرے ہزبنڈ سے مل کر آپ کو بہت خوشی ہوگی۔"

ایک بار پھر انور نے فرجڈیٹر میں اپنا ہاتھ دیا اور سوچا "مجھے اس کے ہزبنڈ سے مل کر کیا خوشی ہوگی، جب کہ یہ خود اس سے ناخوش ہے ـــ اس نے کہا تھا، کہ وہ میرا بالکل خیال نہیں رکھتے۔"

دیر تک وہ جمیل اور اس کی بیوی سے باتیں کرتا رہا کہ شاید ان میں سے کوئی پرویز کے متعلق بات کرے گا اور اس کو اس عورت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہونگی جس کو اس نے ٹھنڈی مولی سمجھا تھا، مگر کوئی ایسی بات نہ ہوئی جو پرویز کی شخصیت پر روشنی ڈالتی۔ جیگروڈل کا ذکر آیا تو مسز جمیل نے صرف اتنا کہا "پری کا ٹیسٹ رنگوں کے بارے میں بہت اچھا ہے۔"

"پرویز ـــ پری" انور نے سوچا "کتنی غلط تخفیف ہے یہ خستہ سی ریڑھ کی ہڈی

والی عورت جس کا رنگ اکتا دینے والی حد تک سفید ہے۔ اس کو پری کہا جائے کیا یہ کوہ قاف کی توہین نہیں؟"

جب پرویز کے متعلق اور کوئی بات نہ ہوئی تو الور نے جمیل سے رخصت چاہی۔ "اچھا بھائی میں چلتا ہوں" پھر وہ مسز جمیل سے مخاطب ہوا۔ "بھابی آپ کی پری بڑی دلچسپ چیز ہے۔"

مسز جمیل مسکرائی۔ "کیوں"

الور نے یونہی کہہ دیا تھا۔ مسز جمیل نے کیوں کہا تو اس کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ مسکرایا۔ "کیا آپ کے نزدیک وہ دل چسپ نہیں؟

"کون ہیں یہ محترمہ؟"

مسز جمیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ جمیل نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔ جمیل مسکرا کر اٹھا اور الور کے کاندھے کو دبا کر اس نے گنگنا کر کہا "چلو تمہیں بتاتا ہوں کون ہیں یہ محترمہ۔۔۔ بڑی واجب تعظیم ہستی ہیں۔"

"آپ کو تو بس کوئی موقعہ ملنا چاہیئے۔۔۔" مسز جمیل کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

جمیل ہنسا۔۔۔ "کیا میں غلط کہتا ہوں۔۔۔ کہ پری واجب تعظیم ہستی نہیں۔"

"میں نہیں جانتی" یہ کہہ کر مسز جمیل اٹھی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ جمیل نے پھر انور کا کندھا دبایا اور اس سے مسکراتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ۔ تمہاری بھابی نے تمہیں پری کے متعلق باتیں کرنے کا موقعہ دیدیا ہے۔"

انور بیٹھ گیا۔ جمیل نے سگریٹ سلگایا اور اس سے پوچھا "تمہیں پری میں کیا دلچسپی نظر آئی؟"

انور نے کچھ دیر اپنے دماغ کو کریدا "دل چسپی؟ — میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال ہے — اس کا غیر دل چسپ ہونا ہی شاید دل چسپی کا باعث ہے۔"

جمیل نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ لفظوں کا الٹ پھیر نہیں چلے گا — صاف صاف بتاؤ تمہیں اس میں کیا دل چسپی نظر آئی؟"

انور کو یہ جرح پسند نہ آئی "مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہدیا ہے۔"

جمیل ہنسا، پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر اس نے سامنے کمرے کی طرف دیکھا۔ اور دبی زبان میں کہا، بڑی خطرناک عورت ہے انور"

انور نے حیرت سے پوچھا "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ محترمہ دو آدمیوں کا خون کرا چکی ہے۔"

انور کی آنکھوں کے سامنے معاً پرویز کا سفید رنگ آگیا، مسکرا کر کہنے لگا۔

"اس کے باوجود لہو کی ایک چھینٹ بھی نہیں اس میں۔"

لیکن فوراً ہی اس کو معاملے کی سنگینی کا خیال آیا تو اس نے سنجیدہ ہو کر جمیل سے پوچھا "کیا کہا تم نے؟ — دو آدمیوں کا خون؟"

انور نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی "جی ہاں — ایک کیپٹن تھا اور دوسرا سر بہاؤالدین کا لڑکا۔"

"کون سر بہاؤالدین؟"

"اماں وہی — جو ایگریکلچرل ڈیپارٹمنٹ میں خدا معلوم کیا تھے۔"

انور کو کچھ پتہ نہ چلا۔ بہاؤالدین کو چھوڑ کر اس نے جمیل سے پوچھا۔

"کیسے خون ہوا ان دونوں کا؟"

"جیسے ہوا کرتا ہے۔ کالج میں کیپٹن صاحب سے پری کا یارانہ تھا۔ شادی کر کے جب وہ بمبئی گئی تو وہاں سر بہاؤالدین کے لڑکے سے راہ و رسم پیدا ہو گئی اتفاق سے ٹریننگ کے سلسلے میں کپتان صاحب وہاں پہنچے۔ پرانے تعلقات قائم کرنا چاہیے تو سر بہاؤالدین کے لڑکے آڑے آئے۔ ایک پارٹی میں دونوں کی چخ ہوئی۔ دوسرے روز کپتان صاحب نے پستول داغ دیا۔ رقیب وہیں ڈھیر ہو گئے۔ پری کو بہت افسوس ہوا۔ سر بہاؤالدین کے لڑکے کی موت کے غم میں اس نے کئی دن سوگ میں کاٹے۔ جب کپتان صاحب کو پھانسی ہوئی تو لوگ کہتے ہیں۔ اس کی آنکھوں نے ہزار ہا اصلی آنسو بہائے — اس کے

بعد ایک نوجوان پارسی اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا۔ وصل کی رات جب اسے پتہ چلا کہ اس کی محبوبہ شادی شدہ ہے تو اس نے اپنے باپ کی ڈسپنسری سے زہر لے کر کھا لیا۔"

انور نے کہا۔ "یہ تو تین خون ہوئے۔"

جمیل مسکرایا۔ "نوجوان پارسی خوش قسمت تھا۔ اس کے باپ نے اسے موت کے منہ سے بچا لیا۔"

"بڑی عجیب و غریب عورت ہے۔" یہ کہہ کر انور سوچنے لگا کہ پرویز جس میں کشش نام کو بھی نہیں کیسے ان ہنگاموں کا باعث ہوئی۔ کپتان نے اس میں کیا دیکھا۔ سر بہاؤالدین کے لڑکے کو اس میں کیا چیز نظر آئی؟ — اور اس نوجوان پارسی نے اس ڈھیلی ڈھالی عورت میں کیا دلکشی دیکھی؟

انور نے پرویز کو تصور میں ننگا کر کے دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ جس پر سفید سفید گوشت منڈھا ہوا تھا۔ خون کے بغیر کولہے دبلے پتلے لڑکے کے کولہوں جیسے تھے۔ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی دم نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کسی نے دبایا تو وہ دو نیم ہو جائے گی۔ بال کٹے ہوئے تھے جو ہائیڈروجن پراوکسائڈ کے استعمال سے اپنا قدرتی رنگ کھو چکے تھے — کیا تھا اس کے سراپا میں؟ — ایک فقط اس کی آنکھیں کچھ غنیمت تھیں۔

انور نے سوچا، صرف آنکھیں کون چاٹتا پھرتا ہے — کوئی بات ہونی چاہیئے — لیکن حیرت ہے کہ اس ٹھنڈی مولی نے اتنے بڑے ہنگامے پیدا کئے۔ مجھ سے تو جب اس نے ہاتھ ملایا تھا، تو میں نے خیال کیا تھا کہ مجھے بدبودار ڈکاریں آنی شروع ہو جائیں گی — کچھ سمجھ میں نہیں آتا لیکن کچھ نہ کچھ ہے ضرور اس پری میں۔"

جمیل نے اسے بتایا کہ راولپنڈی میں پرویز کے کالج کے رومانس مشہور ہیں اس زمانے میں اس کے بیک وقت تین تین چار چار لڑکوں سے رومان چلتے تھے، چھ لڑکے اسی کے باعث کالج بدر ہوئے، ایک کو بیمار ہو کر سینے ٹوریم میں داخل ہونا پڑا۔

انور کی حیرت بڑھتی گئی، اس نے جمیل سے پوچھا، کون ہے اسکا خاوند؟ اور خود کس کی لڑکی ہے؟"

جمیل نے جواب دیا "بہت بڑے باپ کی — کسی زمانے میں احمد آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ آج کل ریٹائرڈ ہیں — خاوند اس کا ہندو ہے۔"

"ہندو؟"

"نہیں، اب عیسائی ہو چکا ہے۔"

"کیا کرتا ہے؟"

"میرا خیال ہے شروع میں اس کا ذکر آیا تھا کہ اکسپورٹ امپورٹ کا کام کرتا ہے۔"

انور کو یاد آگیا۔ "ہاں، ہاں کچھ ایسی بات ہوئی تھی۔ شاید بھابی جان نے بتایا تھا؟"

جمیل اور انور تھوڑی دیر خاموش رہے۔ جمیل نے سگریٹ سلگایا۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر اس کی بیوی نہ سن رہی ہو۔ انور کا کندھا دبا کر سرگوشی میں کہا۔

"تم پری سے ضرور ملو۔ دیکھنا کیا ہوتا ہے؟"

انور نے خود سے پوچھا مگر جمیل سے کہا۔ "کیا ہوگا؟"

جمیل کے ہونٹوں میں ایک شریر سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" پھر اس نے آواز دبا کر کہا "کل شام چائے وہیں پئیں گے۔ اس کا خاوند رات کو آتا ہے۔"

پروگرام طے ہوگیا۔ پری کے متعلق اتنی باتیں سن کر اس کے دماغ میں کھدبد سی ہو رہی ہے۔ وہ بار بار سوچتا تھا۔ ملاقات پہ کیا ہوگا۔ کوئی غیر معمولی چیز وقوع پذیر ہوگی۔ ہو سکتا ہے جمیل نے مذاق کیا ہو۔ ہو سکتا ہے۔ جمیل نے جو کچھ بھی اس کے بارے میں کہا سرتاپا غلط ہو۔ لیکن پھر اسے خیال آتا، جمیل کو خواہ مخواہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

دوسرے روز شام کو جمیل اور وہ دونوں پری کے ہاں گئے۔ وہ غسلخانے میں نہا رہی تھی۔ نوکر نے ان کو بڑے کمرے میں بٹھا دیا۔ انور ووگ کی ورق گردانی کرنے لگا۔ دفعتہً جمیل اٹھا۔ "میں سگریٹ بھول آیا۔ ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

انور "ووگ" میں چھپی ہوئی ایک تصویر دیکھ رہا تھا کہ اسے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نظریں اٹھا کر اس نے دیکھا تو پرویز تھی۔ انور سٹپٹا گیا۔ اس نے سفید پاجامہ پہنا ہوا جو جابجا گیلا تھا۔ ململ کا کرتہ اس کے پانی سے تر بدن کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ مسکرا کر اس نے انور سے کہا آپ بڑے انہماک سے تصویر دیکھ رہے تھے۔"

پرچہ چھوڑ کر انور اٹھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر پرویز اسکے پاس آگئی۔ پرچہ اٹھا کر اس نے ایک ہاتھ سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک طرف کیا۔ اور مسکرا کر کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ آئے ہیں تو میں ایسے ہی چلی آئی" یہ کہہ کر اس نے اپنے ململ کے گیلے کرتے کو دیکھا جس میں دو کالے دھبے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ پھر اس نے انور کا ہاتھ پکڑا۔ "چلئے اندر چلیں۔"

انور منمنایا۔ "جمیل — جمیل بھی ساتھ تھا میرے — سگریٹ بھول آیا تھا — لینے گیا ہے۔"

پرویز نے انور کو کھینچا۔ "وہ آجائے گا — چلئے۔"

انور کو جانا ہی پڑا، جس کمرے میں وہ داخل ہوئے۔ اس میں کوئی کرسی نہیں تھی۔ وہ دو اسپرنگوں والے ساگوانی پلنگ تھے۔ ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ اس کے ساتھ ایک اسٹول پڑا تھا۔ پری اس اسٹول پر بیٹھ گئی اور ایک پلنگ کی طرف اشارہ کر کے انور سے کہا۔ "بیٹھئے"

انور ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گیا اس نے چاہا کہ جمیل آجائے کیونکہ اسے بعد اُلجھن ہو رہی تھی، پرویز کے گیلے کرتے کے ساتھ چمٹے ہوئے وہ کالے دھبے اس کو دو اندھی آنکھیں لگتے تھے جو اسکے سینے کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ انور نے اٹھ کر جانا چاہا۔ "میرا خیال ہے میں جمیل کو بلا دوں" مگر وہ اس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے فریم کی طرف اشارہ کر کے اس نے انور سے کہا۔ "یہ میرے ہزبنڈ ہیں۔ بہت ظالم آدمی ہے جمیل صاحب"

انور مسکرایا۔ "آپ مذاق کرتی ہیں"

"جی نہیں۔ میرے اور اس کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اصل میں شادی سے پہلے مجھے دیکھ لینا چاہیئے تھا کہ وہ سمجھتا ہے کہ نہیں۔ جس چیز کا مجھے شوق ہو، اسے بالکل پسند نہیں ہوتی۔ آپ بتایئے یہ کہتی ہوئی وہ لوٹ لگا کر پلنگ پر اوندھی لیٹ گئی۔ "اس طرح لیٹنے میں کیا ہرج ہے۔"

انور ایک کونے میں سرک گیا۔ اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس نے صرف

اتنا سوچا۔" اس کا درمیانی حصہ کتنا غیر نسوانی ہے۔"

پرویز اوندھی لیٹی رہی۔" آپ نے جواب نہیں دیا مجھے۔ بتائیے اس طرح لیٹنے میں کیا حرج ہے!"

انور کا حلق سوکھنے لگا۔" کوئی حرج نہیں۔"

" لیکن اس کو ناپسند ہے۔ خدا معلوم کیوں" یہ کہہ کر پرویز نے گردن ٹیڑھی کر کے انور کی طرف دیکھا۔" آدمی اس طرح لیٹے تو معلوم ہوتا ہے تیر رہا ہے۔ میں یوں لیٹوں تو اوپر بڑا تکیہ رکھ لیا کرتی ہوں۔ ذرا اٹھائیے نا وہ تکیہ اور میرے اوپر رکھ دیجئے۔

انور کا حلق بالکل خشک ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے۔ اٹھنے لگا۔ تو پرویز نے اپنی پتلی ٹانگ سے اس کو روکا۔

" بیٹھ جائیے نا۔"

" جی میں جمیل ...."

وہ مسکرائی۔" جمیل بے وقوف ہے ایک دن مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا، اپنے خاوند کے سوا میرا اور کسی سے وہ تعلق نہیں رہا جو ایک مرد اور عورت میں ہوتا ہے، تو وہ ہنسنے لگا۔ مجھے تو ویسے بھی اس تعلق سے نفرت ہے"۔ ذرا تکیہ اٹھا کر رکھ دیجئے نا میرے اوپر!"

انور اسی بہانے اٹھا۔ تکیہ دوسرے کونے میں پڑا تھا۔ اسے اٹھایا اور پرویز

کے درمیانی حصے پر جو کہ بہت ہی غیر نسوانی تھا رکھ دیا۔

پرویز مسکرائی "شکریہ۔ بیٹھیے اب باتیں کریں۔"

"جی نہیں۔ آپ تکیے سے باتیں کریں، میں چلا۔" یہ کہہ کر انور پسینہ پونچھتا باہر نکل گیا۔

۱۷ جون ۱۹۵۰ء

خود فریب

ہم نیو ہیرس اسٹور کے پرائیویٹ کمرے میں بیٹھے تھے۔ باہر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو اس کا مالک غیاث اٹھ کر دوڑا۔ میرے ساتھ مسعود بیٹھا تھا اس سے کچھ دور ہٹ کر جلیل دانتوں سے اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں کے ناخن کاٹ رہا تھا۔ اس کے کان بڑے غور سے غیاث کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ ٹیلی فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔

"تم جھوٹ بولتی ہو ——— اچھا خیر آج دیکھ لیں گے ——— لو یہ کیا کہا، تمہارے لئے تو ہماری جان حاضر ہے ——— اچھا تو ٹھیک پانچ بجے ——— خدا حافظ ——— کیا کہا؟ ——— بھئی کہہ تو دیا۔ کہ

تمہیں مل جائے گی۔"

جلیل نے میری طرف دیکھا "منٹو صاحب عیش کرتا ہے یہ غیاث!"

میں جواب میں مسکرا دیا۔

جلیل انگلیوں کے ناخن اب تیزی سے کاٹنے لگا "کئی لڑکیوں کے ساتھ اس کا ٹانکہ ملا ہوا ہے ——— میں تو سوچتا ہوں ایک اسٹور کھول لوں — لیڈیز اسٹور ——— خواہ مخواہ پریس کے چکر میں پڑا ہوں ——— عورت کا سایہ تک بھی وہاں نہیں آتا۔ سارا دن گڑگڑاہٹیں سنو۔ اُلو کے پٹھے قسم کے گاہکوں سے مغز ماری کرو — یہ زندگی ہے؟"

میں پھر مسکرا دیا۔ اتنے میں غیاث آگیا۔ جلیل نے زور سے اس کے چوتڑوں پر دھپا مارا۔ اور کہا "سنا ہے کون تھی جس کے لئے تو اپنی جان حاضر کر رہا تھا۔"

غیاث بیٹھ گیا اور کہنے لگا "منٹو صاحب کے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔"

جلیل نے اپنی عینک کے موٹے شیشوں میں سے گھور کر غیاث کی طرف دیکھا اور کہا "منٹو صاحب کو سب معلوم ہے — تم بتاؤ کون تھی؟"

غیاث نے اپنی نیلے شیشے والی عینک اتار کر اس کی کمانی ٹھیک کرنی شروع

کی۔" ایک نئی ہے ——— پرسوں آئی تھی، ٹیلی فون کرنے ——— کسی سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی۔ فون کر چکی تو میں نے اس سے کہا —— جناب فیس ادا کیجئے۔ یہ سن کر مسکرانے لگی پرس میں ہاتھ ڈال کر اس نے دس روپے کا نوٹ نکالا اور کہا۔

"حاضر ہے" ——— میں نے کہا "شکریہ ——— آپ کا مسکرا دینا ہی کافی ہے ——— بس دوستی ہو گئی۔ ایک گھنٹے تک یہاں بیٹھی رہی، جاتے ہوئے دس روپال لے گئی۔"

مسعود جو بالکل خاموش بیٹھا غالباً اپنی بیکاری کے متعلق سوچ رہا تھا اُٹھا۔

"بکواس ہے ——— محض خود فریبی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے سلام کیا اور چلا گیا۔

غیاث اپنی باتوں سے بہت خوش تھا مسعود جب یکلخت بولا تو اس کا چہرہ کسی قدر مرجھا گیا۔ جلیل تھوڑی دیر کے بعد غیاث سے مخاطب ہوا "کیا مانگ رہی تھی؟"

غیاث چونکا "کیا کہا؟"

جلیل نے پھر پوچھا "کیا مانگ رہی تھی؟"

غیاث نے کچھ توقف کے بعد کہا "میڈن فورم بریزر"

جلیل کی آنکھیں عینک کے موٹے شیشوں کے عقب سے چمکیں۔

"سائز کیا ہے۔"

غیاث نے جواب دیا "تھرٹی فور!"

جلیل مجھ سے مخاطب ہوا "منٹو صاحب یہ کیا بات ہے آنگیا دیکھتے ہی میرے اندر ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے"

میں نے مسکرا کر اس سے کہا "آپ کی قوت متخیلہ بہت تیز ہے۔"

جلیل کچھ نہ سمجھا اور نہ وہ سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کے دماغ میں کُھد بد ہو رہی تھی وہ اس لڑکی کے متعلق باتیں کرنا چاہتا تھا جس کے ساتھ غیاث نے ٹیلی فون پر باتیں کی تھیں، چنانچہ میرا جواب سنکر اس نے غیاث سے کہا "یار ہم سے بھی ملاؤ اسے۔"

غیاث نے کمانی ٹھیک کر کے عینک لگائی "کبھی یہاں آئیگی تو مل لینا۔"

کچھ نہیں یار تم ہمیشہ یہی بُجّہ دیتے رہتے ہو۔ پچھلے دنوں جب وہ یہاں آئی تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟ جمیلہ — میں نے آگے بڑھ کر اس سے بات کرنی چاہی تو تم نے ہاتھ جوڑ کر مجھے منع کر دیا۔ میں اسے کھا تو نہ جاتا" یہ کہہ جلیل نے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے اپنی آنکھیں سکوڑ لیں۔

جلیل اور غیاث دونوں میں چھپنا تھا۔ دونوں ہر وقت لڑکیوں کے متعلق سوچتے رہتے تھے۔ خوبصورت موٹی دبلی بھدی لڑکیوں کے متعلق۔ ٹانگے میں

بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے متعلق ۔ پیدل چلتی اور سائیکل سوار لڑکیوں کے متعلق۔ جلیل اس معاملے میں غیاث سے بازی لے گیا تھا۔ دفتر سے کسی ضروری کام پر موٹر میں نکلتا، راستے میں کوئی ٹانگے میں بیٹھی یا موٹر میں سوار لڑکی نظر آجاتی تو اس کے پیچھے اپنی موٹر لگا دیتا۔ یہ اسکا محبوب ترین شغل تھا۔ لیکن اس نے کبھی بد تمیزی نہ کی تھی چھیڑ چھاڑ سے اسے ڈر لگتا تھا جہاں تک گفتار کا تعلق ہے اسے غازی کہنا چاہیئے بڑے بڑے مضبوط قلعے سر کر چکا تھا۔

پرائیویٹ کمرے میں جب باہر اسٹور سے کوئی نسوانی آواز آتی تو غیاث اچھل پڑتا اور پردہ ہٹا کر ایک دم باہر نکل جاتا۔ گاہکوں سے کوئی اسے دلچسپی نہیں تھی۔ ان سے اس کا ملازم نبٹتا تھا۔

دونوں اپنے کام میں ہوشیار تھے۔ اسٹور کس طرح چلایا جاتا ہے۔ اس کو کیوں کر مقبول بنایا جاتا ہے۔ اس کا غیاث کو بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ اسی طرح جلیل کو پریس کے تمام شعبوں پر کامل عبور تھا۔ لیکن فرصت کے اوقات میں وہ صرف لڑکیوں کے متعلق سوچتے تھے۔ خیالی اور اصلی لڑکیوں کے متعلق۔

اسٹور میں کسی دن جب کوئی بھی لڑکی نہ آتی تو غیاث اداس ہو جاتا یہ اداسی وہ جلیل سے ٹیلیفون پر ان لڑکیوں کے متعلق باتیں کر کے دور کرتا جو بقول اس کے جال میں پھنسی ہوئی تھیں۔ جلیل اسے اپنے معرکے سناتا۔ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے۔ اسٹور میں کوئی گاہک آتا یا ادھر پریس میں کسی کو جلیل کی ضرورت

ہوتی تو یہ دلچسپ سلسلہ گفتگو منقطع ہو جاتا۔

اس لحاظ سے نیو پیرس اسٹور بڑی دلچسپ جگہ تھی۔ جلیل دن میں دو تین مرتبہ ضرور آتا۔ پریس سے کسی کام کے لئے نکلتا تو چند منٹوں کے لئے اسٹور سے ہو جاتا۔ غیاث سے کسی لڑکی کے بارے میں چھیڑ چھاڑ کرتا اور انگلی میں موٹر کی چابی گھماتا چلا جاتا۔

جلیل کو غیاث سے یہ گلہ تھا کہ وہ "اپنی لڑکیوں" کے متعلق انتہائی رازداری سے کام لیتا ہے۔ ان کا نام تک نہیں بتاتا۔ چھپ چھپ کر ان سے ملتا ہے۔ ان کو تحفے تحائف دیتا ہے اور اکیلے اکیلے عیش کرتا ہے۔ یہی گلہ غیاث کو جلیل سے تھا لیکن دونوں کے دوستانہ تعلقات ویسے ویسے قائم تھے۔

ایک روز اسٹور میں ایک سیاہ برقعے والی عورت آئی۔ نقاب الٹا ہوا تھا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ آتے ہی اسٹول پر بیٹھ گئی۔ غیاث جب اس کی طرف بڑھا تو اس نے برقعہ سے پسینہ پونچھ کر اس سے کہا "پانی پلایئے ایک گلاس!!"

غیاث نے فوراً نوکر کو بھیجا کہ ایک ٹھنڈا لیمن لے آئے۔ عورت نے چھت کے ساکن پنکھوں کو دیکھا اور غیاث سے پوچھا "پنکھا کیوں نہیں چلاتے آپ؟"

غیاث نے سراپا معذرت بنکر کہا "دونوں خراب ہو گئے ہیں معلوم نہیں

کیا ہوا — میں نے آدمی بھیجا ہوا ہے۔"

عورت اسٹول پر سے اٹھی "میں تو یہاں ایک منٹ نہیں بیٹھ سکتی" یہ کہہ کر وہ شوکیسوں کو دیکھنے لگی "آدمی خاک شوپنگ کر سکتا ہے اس دوزخ میں۔"

غیاث نے اٹک اٹک کر کہا "مجھے افسوس ہے — آپ — آپ اندر تشریف لے چلئے . . . . . جس چیز کی آپ کو ضرورت ہوگی میں لا کر دوں گا۔"

عورت نے غیاث کی طرف دیکھا "چلئے۔"

غیاث تیز قدمی سے آگے بڑھا، پردہ ہٹایا اور اس عورت سے کہا "تشریف لائیے۔"

عورت اندر کمرے میں داخل ہو گئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ غیاث نے پردہ چھوڑ دیا۔ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ چند لمحات کے بعد غیاث نکلا۔ میرے پاس آ کر اس نے ہولے سے کہا "منٹو صاحب کیا خیال ہے آپ کا اس لڑکی کے بارے میں؟"

میں مسکرا دیا۔

غیاث نے ایک خانے سے مختلف اقسام کی لپ اسٹکیں نکالیں، اور اندر کمرے میں لے گیا۔ اتنے میں جلیل کی موٹر کا ہارن بجا اور وہ انگلی پر چابی

گھا تا نمودار ہوا۔ آتے ہی اس نے پکارا۔ "غیاث ۔ غیاث آؤ بھئی سنو وہ کل والا معاملہ میں نے سب ٹھیک کر دیا ہے"۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا "آفوہ منٹو صاحب۔ آداب عرض ۔ غیاث کہاں ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اندر کمرے میں"۔

"وہ میں نے سب ٹھیک کر دیا منٹو صاحب ۔ ابھی ابھی پٹرول پمپ کے پاس ملی۔ پیدل جا رہی تھی میں نے موٹر روکی اور کہا جناب یہ موٹر آخر کس مرض کی دوا ہے۔ اسے ہزنگ چھوڑ کر آ رہا ہوں ۔" پھر اس نے کمرے کے پردے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

"غیاث باہر نکل بے !"

جمیل نے انگلی پر زور سے چابی گھمائی۔ "مصروف ہے ۔ اب اس نے اندر مصروف ہونا شروع کر دیا ہے۔ کہہ کر اس نے آگے بڑھ کر پردہ اٹھایا، ایک دم اس کے جیسے بریک سی لگ گئی، پردہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا "سوری" کہہ کر وہ الٹے قدم واپس آیا اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں اس نے مجھ سے پوچھا "منٹو صاحب، کون ہے؟"

میں نے دریافت کہاں کون؟"

"یہ ۔ یہ جو اندر بیٹھی ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی ہے"۔

میں نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں گا ہک ہے!"

جلیل نے عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے آنکھیں سکیڑیں اور پردے کی طرف دیکھنے لگا۔ غیاث باہر نکلا جلیل سے "ہلو جلیل" کہا اور آئینہ اٹھا کر واپس کمرے میں چلا گیا۔ دونوں دفعہ جب پردہ اٹھا تو جلیل کو اس عورت کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ میری طرف مڑ کر اس نے کہا۔ "عیش کرتا ہے پٹھا" پھر اضطراب کی حالت میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پردہ اٹھا۔ عورت ہونٹوں کو چوستی ہوئی نکلی جلیل کی نگاہوں نے اس کو اسٹور کے باہر تک پہنچایا۔ پھر اس نے پلٹ کر کمرے کا رخ کیا۔ غیاث باہر نکلا۔ رومال سے ہونٹ صاف کرتا ہے دونوں ایک دوسرے سے قریب قریب ٹکرا گئے۔ جلیل نے تیز لہجے میں اس سے پوچھا۔

"یہ کیا قصہ تھا بھئی۔"

غیاث مسکرایا۔ "کچھ نہیں" یہ کہہ کر اس نے رومال سے ہونٹ صاف کئے۔

جلیل نے غیاث کے چٹکی بھری "کون تھی۔"

"یار تم ایسی باتیں نہ پوچھا کرو۔" غیاث نے اپنا رومال ہوا میں لہرایا۔ جلیل نے چھین لیا۔ غیاث نے جھپٹا مار کر واپس لینا چاہا۔

جلیل پینترہ بدل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ رومال کھول کر اس نے غور سے دیکھا۔ جگہ جگہ سرخ نشان تھے۔ عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس نے غیاث کو گھورا۔ "یہ بات ہے۔"

غیاث ایسا چور بن گیا جس کو کسی نے چوری کرتے کرتے پکڑ لیا ہے" جانے دو یار۔
ادھر لاؤ رومال"

جلیل نے رومال واپس کر دیا۔ "بتاؤ تو سہی کون تھی"

اتنے میں نوکر لیمن لے کر آ گیا۔ غیاث نے اس کو اتنی دیر لگانے پر جھڑکا: "کوئی مہمان آئے تو تم ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے ہو"

غیاث نے جلیل سے پوچھا "یہ لیمن اسی کے لئے منگوایا گیا تھا"

"ہاں یار ـــــ اتنی دیر میں آیا ہے کم بخت ـ دل میں کہتی ہوگی پیاسا ہی بھیج دیا" غیاث نے رومال جیب میں رکھ لیا۔

جلیل نے شوکیس پر سے لیمن کا گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ پی گیا "ہماری پیاس تو بجھ گئی ـــــ لیکن یار بتاؤ نا بھی کون؟ ـــــ پہلی ہی ملاقات میں تم نے ہاتھ صاف کر دیا۔

غیاث نے رومال نکال کر اپنے ہونٹ صاف کئے اور آنکھیں چمکا کر کہا۔ "چمٹ ہی گئی ـــــ میں نے کہا دیکھو ٹھیک نہیں ـــــ دکان ہے ـــــ زبردستی میرے ہونٹوں کا چمّا لے گئی۔

ایک دم مسعود کی آواز آئی "سب بکواس ہے ـ محض خود فریبی ہے"

غیاث چونک پڑا۔ مسعود اسٹور کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور چل دیا۔ جلیل فوراً ہی غیاث سے مخاطب ہوا "چھوڑو یار تم یہ بتاؤ پھر کیا ہوا ـ؟

یار چیز اچھی تھی ۔ کیا نام ہے ؟"

غیاث نے جواب نہ دیا۔ مسعود کی آواز کے اچانک حملے سے وہ بوکھلا سا گیا تھا۔ جلیل کو ایک دم یاد آیا کہ وہ تو ایک بہت ہی ضروری کام پر نکلا ہے انگلی پر چابی گھما کر اس نے غیاث سے کہا۔" لڑکی کے متعلق پھر پوچھوں گا ۔ اچھا منٹو صاحب، اسلام علیکم "

اور چلا گیا۔

میں نے مسکرا کر غیاث سے پوچھا ؛" غیاث صاحب اتنی جلدی پہلی ہی ملاقات میں آپ نے . . . "

غیاث جھینپ گیا میری بات کاٹ کر اس نے کہا ؛" چھوڑیئے منٹو صاحب ——— آپ ہمارے بزرگ ہیں ——— چلئے اندر بیٹھیں یہاں گرمی ہے ۔"

ہم اندر کمرے کی طرف چلنے لگے تو اسٹور کے باہر جلیل کی موٹر رکی۔ اس نے زور زور سے ہارن بجایا۔ غیاث نہ گیا تو وہ خود دوڑا اندر آیا ۔

" غیاث اندر آؤ ——— بس اسٹینڈ کے پاس ایک بڑی خوبصورت لڑکی کھڑی ہے ۔"

غیاث اس کے ساتھ چلا گیا ۔ میں مسکرانے لگا ۔

اس دوران میں جلیل نے بڑی مشکلوں سے اپنے باپ کو راضی کر کے ایک

کر سیمین لڑکی ملازم رکھ لی۔ اس کو وہ اپنی اسٹینو کہتا تھا۔ کئی بار موٹر میں اس کو اپنے ساتھ لایا۔ لیکن اسس کو موٹر ہی میں بٹھائے رکھا۔ غیاث کو اس بات کا بہت غصہ تھا۔ ایک بار اس اسٹینو کے سامنے غیاث نے جلیل کو مذاق کیا۔ تو وہ بہت سٹ پٹایا۔ اس کے کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔ نظریں جھکا کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔

بقول جلیل کے یہ اسٹینو شروع شروع میں تو بڑی ریزرو رہی۔ لیکن آخر اس سے کھل ہی گئی۔

"بس اب چند دنوں میں ہی معاملہ پٹا سمجھو۔"

غیاث اب زیادہ تر جلیل سے اس اسٹینو کی باتیں کرتا۔ جلیل اسس نے اس لڑکی کے متعلق پوچھتا جس نے جھپٹ کر اس کو چوم لیا تھا تو غیاث عموماً یہ کہتا۔ "کل اس کا ٹیلیفون آیا۔ پوچھنے لگی۔ آؤں۔ میں نے کہا یہاں نہیں۔ تم وقت نکالو تو میں کسی اور جگہ کا انتظام کرونگا۔"

جلیل اس سے پوچھتا۔

"کیا کہا اس نے؟"

غیاث جواب دیتا۔

"تم اپنی اسٹینو کی سناؤ"

اسٹینو کی باتیں شروع ہو جاتیں۔

ایک دن میں اور غیاث دونوں جلیل کے پریس گئے۔ مجھے اپنی کتاب کے گرد پوش کے ڈیزائن کے بارے میں دریافت کرنا تھا۔ دفتر میں اسٹینو ایک کونے میں بیٹھی تھی لیکن جلیل نہیں تھا۔ اسٹینو سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی باہر نکلا ہے۔ میں نے نوکر کو بھیجا کہ اس کو ہماری آمد کی اطلاع دے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جلیل آ گیا۔ جب اٹھ کر اس نے مجھے سلام کیا اور غیاث سے کہا، "ادھر آؤ غیاث"

ہم دونوں باہر نکلے۔ غیاث کو ایک کونے میں لیجا کر جلیل نے اچھل کر غیاث سے کہا، "میدان مار لیا — ابھی ابھی تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے" یہ کہہ کر وہ رک گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا، "معاف کیجئے گا منٹو صاحب" پھر اس نے غیاث کو زور سے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ "بس میں نے آج اسکو پکڑ لیا — بالکل اسی طرح — اور اسی جگہ — اس ٹریڈل کے پاس۔"

غیاث نے پوچھا، "کیسے؟"

جلیل جھنجھلا گیا۔ "اپنی اسٹینو کو — قسم خدا کی مزا آ گیا — یہ دیکھو" اس نے اپنا رومال پتلون کی جیب سے نکال کر ہوا میں لہرایا — اس پر سرخی کے دھبے تھے۔ ایک دم مسعود کی آواز آئی۔ "بکواس ہے — محض خود فریبی ہے۔"

جلیل اور غیاث چونک اٹھے — میں مسکرایا۔ ٹریڈل کے توے پر سرخ روغن کی پتلی سی ہموار تہہ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جگہ پونچھنے کے باعث کچھ خراشیں پڑ گئی تھیں۔

۸ / جون ۱۹۵۰ء

برمی لڑکی

گیان کی شوٹنگ تھی اسلئے کفایت جلدی سو گیا۔ فلیٹ میں اور کوئی نہیں تھا بیوی بچے راولپنڈی چلے گئے تھے، ہمسایوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یوں بھی بمبئی میں لوگوں کو اپنے ہمسایوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ کفایت نے اکیلے برانڈی کے چار پگ پیے کھانا کھایا۔ نوکروں کو رخصت کیا اور دروازہ بند کر کے سو گیا۔

رات کے پانچ بجے کے قریب کفایت کے خمار آلود کانوں کو دھک کی آواز سنائی دی اس نے آنکھیں کھولیں نیچے بازار میں ایک ٹریم دندناتی ہوئی گزری۔ چند لمحات کے بعد دروازے پر بڑے زوروں کی دستک ہوئی۔ کفایت اٹھا۔ پلنگ سے اترا تو اس کے ننگے پیر ٹخنوں تک پانی میں چلے گئے اس کو سخت حیرت ہوئی کہ کمرے میں اتنا پانی کہاں سے آیا اور باہر کوٹھری میں اس سے بھی زیادہ پانی تھا۔ دروازے پر دستک جاری تھی اس نے پانی

کے متعلق سوچنا چھوڑا اور دروازہ کھولا۔

گیان نے زور سے کہا۔ "یہ کیا ہے؟"

کفایت نے جواب دیا۔ "پانی"

"پانی نہیں۔ عورت!" یہ کہہ کر گیان نیم اندھیرے میں کوٹری ڈور میں داخل ہوا اس کے پیچھے ایک چھوٹے سے قد کی لڑکی تھی۔

گیان کو فرش پر پھیلے ہوئے پانی کا کچھ احساس نہ ہوا۔ لڑکی نے پائجامہ اوپر اٹھالیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گیان کے پیچھے چلی گئی۔

کفایت کے ذہن میں پہلے پانی تھا۔ اب یہ لڑکی اس میں داخل ہو گئی اور ڈوبکیاں لگانے لگی سب سے پہلے اس نے سوچا کہ یہ کون ہے شکل صورت اور لباس کے اعتبار سے بری معلوم ہوتی ہے لیکن گیان اسے کہاں سے لے آیا؟

گیان اندر کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کئے بغیر پلنگ پر لیٹا اور لیٹے ہی سو گیا۔ کفایت نے اس سے بات کرنا چاہی، مگر اس نے صرف ہوں ہاں میں جواب دیا اور آنکھیں نہ کھولیں کفایت نے اس لڑکی کی طرف ایک نظر دیکھا جو سامنے والے پلنگ پر بیٹھی تھی اور باہر نکل گیا

باورچی خانے میں جا کر اسے معلوم ہوا کہ ربڑ کا وہ پائپ جو رات کو بڑا ڈرم بھرا کرتا تھا۔ باہر نکلا ہوا ہے تین بجے جب نل میں پانی آیا تو اس نے تمام کمرے سیراب کر دیئے۔ تینوں نوکر باہر گلی میں سو رہے تھے۔ کفایت نے ان کو جگایا اور پانی خارج کرنے کے کام پر لگا دیا وہ خود بھی ان کے ساتھ شریک تھا۔ سب چلوؤں سے پانی اٹھاتے تھے اور بالٹیوں میں ڈالتے جاتے

تھے۔ اس برمی لڑکی نے جب ان کو یہ کام کرتے دیکھا تو جھٹ پٹ سینڈل اتار کر ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔

اس کے چھوٹے چھوٹے گورے ہاتھ انگلیوں کے ناخن بڑھائے ہوئے اور سرخی لگے نہیں تھے۔ چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے بال تھے۔ جن میں ہلکی ہلکی لہریں تھیں۔ مردار موضع کا مگر کھلا ریشمی پاجامہ پہنے تھی۔ اس پر سیاہ رنگ کا ریشمی کرتا تھا جس میں اس کی چھوٹی چھوٹی چھاتیاں چھپی ہوئی تھیں۔

جب اس نے ان لوگوں کا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو کفایت نے اسے منع کیا۔

"آپ تکلیف نہ کیجئے یہ کام ہو جائے گا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چھوٹے چھوٹے سرخی لگے ہونٹوں سے مسکرائی اور کام میں لگی رہی۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر تینوں کمروں سے پانی نکل گیا۔ کفایت نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا اسی بہانے سارا گھر دھل کر صاف ہو گیا۔"

وہ برمی لڑکی ہاتھ دھونے کے لئے غسلخانے میں چلی گئی۔ کفایت کمر سیدھی کرنے کے لئے بستر پر لیٹا نیند پوری نہیں ہوئی تھی سو گیا۔

تقریباً نو بجے وہ جاگا اور جاگتے ہی اسے سب سے پہلے پانی کا خیال آیا۔ پھر اس نے برمی لڑکی کے متعلق سوچا جو گیان کے ساتھ آئی تھی۔ یہ کہیں خواب تو نہیں تھا۔ لیکن یہ سامنے گیان سو رہا ہے اور فرش بھی دھلا ہوا ہے"۔

کفایت نے غور سے گیان کی طرف دیکھا۔ وہ پتلون کوٹ بلکہ جوتے سمیت اوندھا

سو رہا تھا۔ کفایت نے اس کو جگایا اس نے ایک آنکھ کھولی اور پوچھا "کیا ہے؟"

"یہ لڑکی کون ہے؟"

گیان ایک دم چونکا "لڑکی ۔۔۔ کہاں ہے" پھر فوراً ہی چت لیٹ گیا۔

"اوہ ۔ بکواس نہ کرو ۔ ٹھیک ہے"

کفایت نے اسے پھر جگانے کی کوشش کی مگر وہ خاموش سویا رہا۔ اس کو ساڑھے نو بجے اپنے کام پر جانا تھا۔ اس نے جلدی جلدی غسل کیا، شیو بھی غسل خانے کے اندر ہی کر لیا۔ باہر نکل کر ڈرائنگ روم میں گیا تو اس کو میز سجی ہوئی نظر آئی۔

صبح ناشتہ پر عام طور پر کفایت کے ہاں بہت سی مختصر چیزیں ہوتی تھیں۔ دو ابلے ہوئے انڈے دو توس، مکھن اور چائے۔ مگر آج میز رنگین تھی۔ اس نے غور سے دیکھا، چھلے ہوئے انڈے عجیب و غریب انداز میں کٹے ہوئے تھے کہ پھول معلوم ہوتے تھے۔ سلاد تھا، بڑے خوبصورت طریقے سے پلیٹ میں سجا ہوا توسوں پر بھی مینا کاری کی ہوئی تھی۔ کفایت چکرا گیا۔ باورچی خانے میں گیا تو وہ برمی لڑکی چوکی پر بیٹھی سامنے انگیٹھی رکھے کچھ کہہ رہی تھی۔ تینوں نوکر اس کے ارد گرد تھے۔ اور ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کفایت کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ برمی لڑکی نے آنکھیں گھما کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

کفایت نے اس سے بات کرنا چاہی۔ لیکن وہ کیسے کرتا۔ اس سے کیا کہتا وہ اسکو جانتا تک نہیں تھا۔ اس نے اپنے ایک نوکر سے صرف اتنا پوچھا "یہ ناشتہ آج کس نے تیار کیا ہے بشیر؟"

بشیر نے اس برمی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔" بائی جی ہے"

وقت بہت کم تھا کفایت نے جلدی جلدی بانکا سجیلا ناشتہ کھایا اور کپڑے پہن کر اپنے دفتر روانہ ہو گیا۔ شام کو واپس آیا تو وہ برمی لڑکی اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکلوتا پاجامہ پہنے اپنا کرتہ استری کر رہی تھی، کفایت پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ وہ صرف پاجامہ پہنے تھی۔

" آجائیے "

لہجہ بڑا صاف ستھرا تھا، کفایت نے سوچا کہ برمی لڑکی کی بجائے شاید کوئی اور بولا ہے جب وہ اندر گیا تو اس لڑکی نے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر کے اس کو سلام کیا کفایت کی موجودگی میں اس نے کوئی حجاب محسوس نہ کیا، بڑے سکون سے وہ اپنا سیاہ کرتا استری کرتی رہی، کفایت نے دیکھا اس کی چھوٹی چھوٹی گول چھاتیوں کے درمیانی حصے میں استری کی گرمی کے باعث پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جمع ہو گئی تھیں۔

کفایت نے گیان کے بارے میں پوچھنے کیلئے بشیر کو آواز دینا چاہی مگر رک گیا۔ اس نے مناسب خیال نہ کیا کیونکہ وہ لڑکی آدھی ننگی تھی، اس نے ہیٹ اتار کر ایک طرف رکھا۔ تھوڑی دیر اس نیم عریانی کو دیکھا مگر کوئی ہیجان محسوس نہ کیا۔ لڑکی کا بدن بے داغ تھا۔ جلد نہایت ہی ملائم تھی۔ اتنی ملائم کہ نگاہیں پھسل پھسل جاتی تھیں۔

کرتا استری ہو گیا تو اس نے سوئچ آوف کیا اور ایک اور بھی کرتا تھا سفید بوسکی کا جو تہہ کیا ہوا استری شدہ پاجامے پر رکھا اس نے یہ سب کپڑے اٹھائے اور کفایت سے مخاطب ہوئی ہیں نہانے چلی ہوں۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ کفایت ٹوپی اتار کر سر کھجلانے لگا۔ "کون ہے یہ ؟"

اس کے دماغ میں بڑی گھدبد ہو رہی تھی جب بھی وہ اس لڑکی کے متعلق سوچتا سارا واقعہ اس کے سامنے آجاتا۔ رات کو اس کا اٹھنا، پانی ہی پانی۔ اس کا دروازہ کھولنا اور کہنا "پانی" اور گیان کا یہ جواب دینا "پانی نہیں عورت" اور ایک ننھی سی گڑیا کا چھم سے اندر آجانا۔

کفایت نے دل میں کہا" ہٹاؤ جی۔ گیان آئیگا تو سب کچھ معلوم ہو جائیگا۔ لونڈیا ہے دلچسپ۔ اتنی چھوٹی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ آدمی جیب میں رکھ لے۔ چلو برانڈی پیئیں۔

بشیر نے گلاس، برانڈی اور برف وغیرہ سب کچھ ملاقاتی کمرے میں تپائی پر رکھدیا تھا کفایت نے کپڑے بدلے اور پینا شروع کردی۔ پہلا پگ ختم کیا تو اسے غسل خانے کا دروازہ کھلنے کی "چوں" سنائی دی۔ دوسرا پگ ڈال کر وہ انتظار کرنے لگا کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ برمی لڑکی ضرور ادھر آئے گی۔ اسکے مقررہ چار پگ ختم ہو گئے مگر وہ نہ آئی۔ گیان بھی نہ آیا۔

کفایت جھنجھلا گیا۔ اندر بیڈ روم میں جا کر اس نے دیکھا وہ لڑکی استری کئے ہوئے کپڑے پہنے اپنی گول گول چھاتیوں پر ہاتھ رکھے بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔ استری والی میز پر اس کے سلیپنگ سوٹ کا الگ تا پاجامہ بڑی اچھی طرح تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔

کفایت نے واپس جاکر برانڈی کا ایک ڈبل پگ گلاس میں ڈالا اور نیٹ ہی چڑھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا سر گھومنے لگا۔ اس نے برمی لڑکی کے متعلق سوچنے کی کوشش کی مگر اس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ چلوؤں میں پانی بھر بھر کے اس کے دماغ

ہیں ڈال رہی ہے، کھانا کھائے بغیر وہ صوفے پر لیٹ گیا اور اس برمی لڑکی کے متعلق کچھ سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے سو گیا۔

صبح ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ صوفے کی بجائے اندر اپنے پلنگ پر ہے۔ اس نے حافظے پر زور دیا۔ "میں رات کب آیا یہاں — کیا میں نے کھانا کھایا تھا؟"

کفایت کو جواب نہ ملا، سامنے والا پلنگ خالی تھا۔ اس نے زور سے بشیر کو آواز دی، وہ بھاگا اندر آیا، کفایت نے اس سے پوچھا۔ "گیان صاحب کہاں ہیں؟"

بشیر نے جواب دیا۔ "رات کو نہیں آئے۔"

"کیوں"

"معلوم نہیں صاحب۔"

"وہ بائی جی کہاں ہیں؟"

"مچھلی تل رہی ہیں۔"

کفایت کے دماغ میں مچھلیاں تلی جانے لگیں، اُٹھ کر باورچی خانے میں گیا تو وہ چوکی پر بیٹھی سامنے انگیٹھی رکھے مچھلی تل رہی تھی۔ کفایت کو دیکھ کر اسکے ہونٹوں پر ایک چھوٹی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی ہاتھ اٹھا کر اس نے سلام کیا اور اپنے کام میں مشغول ہوگئی — کفایت نے دیکھا تینوں نوکر بیحد مسرور تھے اور بڑی مستعدی سے اس لڑکی کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

بشیر کو کچھ دنوں کی چھٹی پر اپنے وطن جانا تھا کئی دنوں سے وہ بار بار کہتا تھا کہ صاحب مجھے تنخواہ دے دیجئے، مجھے گھر سے کئی خط آچکے ہیں، والدہ بیمار ہے۔ رات کو وہ اسے

تنخواہ دینا بھول گیا تھا اب اسے یاد آیا تو اس نے بشیر سے کہا" ادھر آؤ بشیر، اپنی تنخواہ لے لو۔ میں کل دفتر سے روپے لے آیا تھا۔

بشیر نے تنخواہ لے لی، کفایت نے اس سے پوچھا۔ نو بجے گاڑی جاتی ہے۔ اس سے چلے جاؤ۔"

" اچھا جی!" یہ کہہ کر بشیر چلا گیا۔

ناشتہ بے حد لذیذ تھا خاص طور پر مچھلی کے ٹکڑے اس نے کھانا شروع کرنے سے پہلے بشیر کے ذریعہ سے اس برمی لڑکی کو بلا بھیجا مگر وہ نہ آئی۔ بشیر نے کہا" جی وہ کہتی ہیں کہ بعد میں کریں گی وہ ناشتہ"

کفایت کی مالی حالت بہت پتلی تھی، گیان بھی آسودہ حال نہیں تھا دونوں ادھر ادھر سے پکڑ کر گزارہ کر رہے تھے، برانڈی کا بندوبست گیان کر دیتا تھا، باقی کھانے پینے کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا تھا جس فلم کمپنی میں گیان کام کر رہا تھا اس کا دیوالہ نکلنے کے قریب تھا مگر اس کو یقین تھا کہ کوئی معجزہ ضرور رونما ہوگا اور اس کی کمپنی سنبھل جائیگی، شوٹنگ ہو رہی تھی غالباً اسی لیے گیان رات کو نہ آسکا تھا۔

ناشتہ کرنیکے بعد کفایت نے جھانک کر باورچی خانے میں دیکھا۔ لڑکی اپنے کام میں مشغول تھی، تینوں ملازم لڑکے اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے، کفایت نے بشیر سے کہا" مچھلی بہت اچھی تھی۔"

لڑکی نے مڑ کر دیکھا اس کے ہونٹوں پر چھوٹی سی مسکراہٹ تھی۔

کفایت دفتر چلا گیا اس کو امید تھی کہ کچھ روپوں کا بندوبست ہو جائیگا۔ لیکن خالی جیب واپس آیا۔ برمی لڑکی اندر بیڈ روم میں لیٹی تصویروں والا رسالہ دیکھ رہی تھی۔ کفایت کو دیکھ کر بیٹھ گئی اور سلام کیا۔

کفایت نے سلام کا جواب دیا اور اس سے پوچھا "گیان صاحب آئے تھے۔"

"آئے تھے دوپہر کو۔ کھانا کھا کر چلے گئے۔ پھر شام کو آئے، چند منٹوں کیلئے" یہ کہہ کر اس نے ایک طرف ہٹ کر تکیہ اٹھایا اور کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل نکالی۔ "یہ دے گئے تھے کہ میں آپ کو دیدوں۔"

میں نے بوتل پکڑی، کاغذ پر گیان کے یہ چند الفاظ تھے "کم بخت یہ چیز کسی نہ کسی طرح مل جاتی ہے لیکن پیسہ نہیں ملتا۔ بہر حال عیش کرو۔ تمہارا گیان۔"

اس نے کاغذ کھولا۔ برانڈی کی بوتل تھی۔ برمی لڑکی نے کفایت کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ کفایت بھی مسکرا دیا۔ "آپ پیتی ہیں؟"

لڑکی نے زور سے اپنا سر ہلایا۔ "نہیں!"

کفایت نے نظر بھر کر اسکو دیکھا اور سوچا "کیا چھوٹی سی ننھی منی گڑیا ہے!" اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے، چنانچہ اس سے مخاطب ہوا۔ "آیئے، ادھر دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔"

"نہیں۔ میں کپڑے دھوؤں گی۔"

"اس وقت؟"

"اس وقت اچھا ہوتا ہے۔ رات دھوئے، صبح سوکھ گئے۔ اٹھتے ہی استری کرلیئے۔"

کفایت تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ اسے کوئی بات نہ سوجھی تو ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر برانڈی پینا شروع کردی۔ کھانے کا وقت ہوگیا۔ اس نے برمی لڑکی کو بلایا۔ مگر اس نے کہا "میں گیان صاحب کے ساتھ کھاؤں گی۔"

کفایت نے کھانا کھایا اور اپنے پلنگ پر سوگیا۔ رات کے تقریباً ایک بجے اسکی آنکھ کھلی چاندنی رات تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا بھی بڑے مزے کی چل رہی تھی۔ کروٹ بدلی تو دیکھا سامنے پلنگ پر ایک چھوٹی سی سڈول گڑیا گیان کے چوڑے بالوں بھرے سینے کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے کفایت نے آنکھیں بند کرلیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد گیان کی آواز آئی "جاؤ اب مجھے سونے دو۔ کپڑے پہن لو۔"

اس سرنگوں والے پلنگ کی آواز کے ساتھ ساتھ ریشم کی سرسراہٹیں کفایت کے کانوں میں داخل ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کفایت سوگیا۔ صبح چھ بجے اٹھا کیونکہ وہ رات کو یہ سوچ کر سویا تھا کہ صبح جلدی اٹھے گا۔ اسے ٹرام کا بہت لمبا سفر طے کرکے ایک آدمی کے پاس جانا تھا جس سے اسے کچھ ملنے کی امید تھی۔ پلنگ پر سے اترا تو اس نے دیکھا کہ برمی لڑکی ننگے فرش پر اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکلوتا پاجامہ پہنے اپنے چھوٹے سے سڈول بازو کو سر کے نیچے رکھے بڑے سکون سے سو رہی تھی۔ کفایت نے اس کو جگایا۔ اس نے اپنی کالی کالی آنکھیں کھولیں۔ کفایت نے اس سے کہا "آپ یہاں کیوں لیٹی ہیں۔"

اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر ننھی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اٹھ کر اس نے جواب

دیا۔ "گیان کو عادت نہیں کسی کو اپنے ساتھ سلانے کی۔"

کفایت کو گیان کی اس عادت کا علم تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ "جائیے میرے پلنگ پر لیٹ جائیے۔"

لڑکی اٹھی اور کفایت کے پلنگ پر لیٹ گئی۔

کفایت غسلخانے میں گیا۔ وہاں رسی پہ برمی لڑکی کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ کفایت صابن مل کر نہانے لگا۔ تو اس کا خیال اس لڑکی کے ملائم جسم کی طرف چلا گیا جس پہ سے نگاہیں پھسل پھسل جاتی تھیں۔

غسل سے فارغ ہو کر کفایت نے کپڑے پہنے چونکہ جلدی میں تھا اسلئے گیان کو جگا کر اس سے کوئی بات نہ کر سکا۔ صبح کا نکلا رات کے گیارہ بجے واپس آیا۔ جیبیں خالی تھیں۔ بیڈروم میں گیا تو گیان اور برمی لڑکی دونوں اکٹھے لیٹے ہوئے تھے۔ کفایت نے ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر برانڈی پینی شروع کر دی بہت تھکا ہوا تھا۔ مایوس واپس آیا تھا۔ برمی لڑکی کے متعلق سوچتے سوچتے وہیں صوفے پر سو گیا۔ صبح پانچ بجے اٹھا۔ تپائی اس کا چوتھا پگ پانی میں پڑا باسی ہو رہا تھا۔

کفایت اٹھا بیڈروم کے ننگے فرش پر برمی لڑکی سو رہی تھی۔ گیان الماری کے آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا۔ ٹائی کی گرہ ٹھیک کر کے اس نے دونوں ہاتھوں میں لڑکی کو اٹھایا اور اپنے پلنگ پہ لٹا دیا۔ مڑا تو اس نے کفایت کو دیکھا۔ "کیوں بھئی کچھ بندوبست ہوا روپوں کا۔"

کفایت نے بڑی مایوسی سے کہا "نہیں"

"تو میں جاتا ہوں ۔ دیکھو شاید کچھ ہو جائے ۔"

پیشتر اس کے کہ کفایت اسے روکے گیان تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ کھلا تو اس کی آواز آئی "تم بھی کوشش کرنا کفایت"

کفایت نے پلٹ کر پلنگ کی طرف دیکھا۔ لڑکی بڑے سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ اسکے ننھے سے سینے پر چھوٹی چھوٹی گول گول چھاتیاں چمک رہی تھیں۔ کفایت کمرے سے نکل کر غسل خانے میں چلا گیا۔ اندر رسی پر لڑکی کے دھلے ہوئے کپڑے لٹک رہے تھے۔

غسل خانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا لڑکی نوکروں کے ساتھ ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی۔ ناشتہ کر کے باہر نکل گیا۔

چار روز اسی طرح گزر گئے۔ کفایت کو اس لڑکی کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ گیان کبھی رات کو دیر سے آتا تھا، کبھی دن کو بہت جلدی نکل جاتا تھا۔ یہی حال کفایت کا تھا۔ دونوں پریشان تھے۔ پانچویں روز جب وہ صبح اٹھا تو بشیر نے کفایت کو گیان کا رقعہ دیا۔ اس میں لکھا تھا "خدا کے لئے کسی نہ کسی طرح دس روپے پیدا کر کے برمی لڑکی کو دیدو۔"

لڑکی کھڑی استری کر رہی تھی۔ بلاوز کی صرف ایک آستین باقی رہ گئی تھی جس پر وہ بڑے سلیقے سے استری پھیر رہی تھی۔ کفایت نے اس کی طرف دیکھا

جب ان کی نگاہیں چار ہوئیں تو لڑکی مسکرا دی۔ کفایت سوچنے لگا کہ وہ دس روپے کہاں سے پیدا کرے۔ بشیر پاس کھڑا تھا۔ اس نے کفایت سے کہا "صاحب ادھر آئیے۔"

کفایت نے پوچھا "کیا بات ہے۔"

"جی کچھ کہنا ہے۔"

بشیر نے ایک طرف ہٹ کر دس روپے کا نوٹ نکالا اور کفایت کو دیدیا۔

"میں نہیں گیا ابھی تک صاحب۔"

کفایت نوٹ لے کر سوچنے لگا "نہیں نہیں — تم رکھو — لیکن تم گئے کیوں نہیں ابھی تک گئے!"

"صاحب چلا جاؤں گا کل پرسوں — آپ رکھئے یہ روپے۔"

کفایت نے نوٹ جیب میں ڈال لیا "اچھا میں شام کو لوٹا دوں گا تمہیں۔"

کپڑے وپڑے پہن کر جب بری لڑکی ناشتہ کر چکی تو کفایت نے اس کو دس روپے کا نوٹ دیا اور کہا۔

"گیان صاحب نے دیا تھا کہ آپ کو دیدوں۔"

لڑکی نے نوٹ لے لیا اور بشیر کو آواز دی۔ بشیر آیا تو اس سے کہا "جاؤ ٹیکسی لے آؤ۔"

بشیر چلا گیا تو کفایت نے اس سے پوچھا "آپ جا رہی ہیں۔"

"جی ہاں !"

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور بیڈ روم میں چلی گئی وہ اپنا رومال استری کرنا بھول گئی تھی۔ کفایت نے اس سے باتیں کرنے کا ارادہ کیا تو ٹیکسی آگئی رومال ہاتھ میں لیکر وہ روانہ ہونے لگی۔ کفایت کو سلام کیا اور کہا۔" اچھا جی — میں چلتی ہوں۔ گیان کو میرا سلام بول دینا۔"

پھر اس نے تینوں نوکروں سے ہاتھ ملایا اور چلی گئی۔ سب کے چہروں پر اداسی چھا گئی۔

پونے گھنٹے کے بعد گیان آیا۔ وہ کچھ لے کر آیا تھا۔ آتے ہی اس نے کفایت سے پوچھا۔" کہاں ہے وہ برمی لڑکی ؟"

"چلی گئی"

"کیسے ؟ دس روپے دیئے تھے تم نے اسے ؟"

"ہاں"

"تو ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے !" گیان کرسی پر بیٹھ گیا۔

کفایت نے پوچھا" کون تھی یہ لڑکی "

"معلوم نہیں"

کفایت سراپا حیرت بن گیا" کیا مطلب ؟"

گیان نے جواب دیا" مطلب یہی کہ میں نہیں جانتا کون تھی۔"

"جھوٹ!"

"تمہاری قسم سچ کہتا ہوں۔"

کفایت نے پوچھا۔ "کہاں سے مل گئی تمہیں"

گیان نے ٹانگیں میز پر رکھدیں اور مسکرایا۔ "عجیب داستان ہے یار۔ پانی کا سیلاب آنیوالی رات میں شنکر کے ہاں چلا گیا۔ وہاں بہت پی۔ اندھیری اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوا تو سو گیا۔ گاڑی مجھے سیدھی چرچ گیٹ لے گئی۔ وہاں مجھے چوکیدار نے جگایا کہ اٹھو ———— میں نے کہا۔ بھئی مجھے گرانٹ روڈ جانا ہے۔ چوکیدار ہنسا۔ آپ پانچ اسٹیشن آگے چلے آئے ہیں۔ اترا دوسرے پلیٹ فارم پر اندھیری جانے والی آخری گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں سوار ہو گیا۔ گاڑی چلی تو پھر مجھے نیند آگئی۔ سیدھا اندھیری پہنچ گیا۔"

کفایت نے پوچھا۔ "مگر اس سے لڑکی کا کیا تعلق"

"تم سن تو لو" گیان نے سگریٹ سلگایا۔ "اندھیری پہنچا یعنی جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں میں ایک چھوٹی سی لونڈیا کے ساتھ چمٹا ہوں۔ پہلے تو میں ڈرا، وہ جاگ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کون ہو تم؟" ــــ وہ مسکرائی۔ میں نے پھر پوچھا۔ کون ہو بھئی تم ــــ وہ مسکرائی اور کہنے لگی تو اتنی دیر سے مجھے چومتے رہے اور اب پوچھتے ہو، میں کون ہوں ــــ میں نے حیرت سے کہا، اچھا ــــ

وہ ہنسنے لگی میں نے دماغ پر زور دے کر سوچا، مناسب خیال نہ کیا اور اُس کو اپنے ساتھ کھینچ لیا ——— صبح تین بجے تک ہم دونوں پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر سوئے رہے ساڑھے تین کی پہلی گاڑی آئی تو اس میں سوار ہو گئے میرا ارادہ تھا کہ بندوبست کر کے اس کو کچھ روپے دوں گا۔ یہاں پہنچے تو پانی کا طوفان آیا ہوا تھا ۔ ہے نا۔ دلچسپ داستان۔"

کفایت نے کہا "خاصی دلچسپی ہے۔ مگر وہ اتنے دن کیوں رہی یہاں؟"

گیان نے سگریٹ فرش پر پھینکا "وہ کہاں رہی۔ میں نے اسے رکھا۔ اصل میں وہ یوں رہی کہ میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں جو اسے دیتا۔ بس دن گزرتے گئے میں بے حد شرمندہ تھا۔ کل رات میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ دیکھو بھئی، دن بڑھتے جا رہے ہیں۔ تم ایسا کرو۔ مجھے اپنا اڈریس دیدو۔ میں تمہارا حق تمہیں وہاں پہنچا دوں گا۔ آجکل میرا حال بہت پتلا ہے۔"

کفایت نے پوچھا "یہ سن کر اس نے کیا کہا؟"

گیان نے سر کو جنبش دی۔ "عجیب ہی لڑکی تھی ——کہنے لگی، یہ کیا کہتے ہو —— میں نے تم سے کب مانگا ہے۔ —— لیکن دس روپے مجھے دیدینا —— میرا گھر یہاں سے بہت دور ہے ٹیکسی میں جاؤں گی۔ میرے پاس ایک بھی پیسہ نہیں۔"

کفایت نے سوال کیا "نام کیا تھا اس کا؟"

گیان سوچنے لگا۔

"بھول گئے؟"

گیان نے اپنی ٹانگیں میز پر سے ہٹائیں۔ "نہیں یار — میں نے اس سے نام نہیں پوچھا۔

حد ہو گئی — یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

۱۰ر جون ۱۹۵۰ء

محمد سعید کمال خوشنویس

فوبھابائی

حیدرآباد سے شہاب آیا تو اس نے بمبئے سنٹرل اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہلا قدم رکھتے ہی حنیف سے کہا۔ "دیکھو بھائی، آج شام کو وہ معاملہ ضرور ہو گا۔ ورنہ یاد رکھو میں واپس چلا جاؤں گا۔"

حنیف کو معلوم تھا کہ "وہ معاملہ" کیا ہے۔ چنانچہ شام کو اس نے ٹیکسی لی۔ شہاب کو ساتھ لیا۔ گرانٹ روڈ کے ناکے پر ایک دلال کو بلایا اور اس سے کہا "میرے دوست حیدرآباد سے آئے ہیں، ان

کے لئے ایک اچھی چھوکری چاہیئے۔"

دلال نے اپنے کان سے اڑسی ہوئی بیڑی نکالی اور اس کو ہونٹوں میں دبا کر کہا، "دکنی چلے گی!"

حنیف نے شہاب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، شہاب نے کہا، "نہیں بھائی۔ مجھے کوئی مسلمان چاہیئے۔"

"مسلمان!" دلال نے بیڑی کو چوسا "چلئے" اور یہ کہہ کر وہ ٹیکسی کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور سے اس نے کچھ کہا، ٹیکسی اسٹارٹ ہوئی۔ اور مختلف بازاروں سے ہوتی ہوئی فورجٹ اسٹریٹ کی ساتھ والی گلی میں داخل ہوئی یہ گلی ایک پہاڑی پر تھی، بہت اونچان تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کو فرسٹ گیئر میں ڈالا۔ حنیف کو ایسا محسوس ہوا کہ راستے میں ٹیکسی رک کر واپس چلنا شروع کر دے گی، مگر ایسا نہ ہوا، دلال نے ڈرائیور کو اونچان کے عین آخری سرے پر جہاں چوک سا بنا تھا رکنے کے لئے کہا۔

حنیف کبھی اس طرف نہیں آیا تھا اونچی پہاڑی تھی جس کے دائیں طرف ایک دم ڈھلان تھی۔ جس بلڈنگ میں دلال داخل ہوا اس کی طرف دو منزلیں تھیں، حالانکہ دوسری طرف کی بلڈنگیں سب کی سب چار منزلہ تھیں۔ حنیف کو بعد میں معلوم ہوا کہ ڈھلان کے باعث اس بلڈنگ کی تین منزلیں نیچے

تھیں جہاں لفٹ جاتی تھی۔

شہاب اور حنیف دونوں خاموش بیٹھے رہے انہوں نے کوئی بات نہ کی۔ راستے میں دلال نے اس لڑکی کی بہت تعریف کی تھی جس کو لانے وہ اس بلڈنگ میں گیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ بڑے اچھے خاندان کی لڑکی ہے اسپیشل طور پر آپ کے لئے نکال رہا ہوں۔"

دونوں سوچ رہے تھے یہ لڑکی کیسی ہوگی جو اسپیشل طور پر نکالی جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دلال نمودار ہوا۔ وہ اکیلا تھا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا۔ گاڑی واپس کرو۔" یہ کہہ کر وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی ایک چکر لیکر مڑی۔ تین چار بلڈنگیں چھوڑ کر دلال نے ڈرائیور سے کہا "روک لو" پھر حنیف سے مخاطب ہوا۔ "آرہی ہے۔ پوچھ رہی تھی "کیسے آدمی ہیں"۔ میں نے کہا "نمبر ون"

دس پندرہ منٹ کے بعد ایکدم ٹیکسی کا دروازہ کھلا اور ایک عورت حنیف کے ساتھ بیٹھ گئی۔ رات کا وقت تھا۔ گلی میں روشنی کم تھی اس لئے شہاب اور حنیف دونوں اس کو اچھی طرح نہ دیکھ سکے۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے کہا "چلو"

ٹیکسی تیزی سے نیچے اترنے لگی۔

حنیف کے پاس کوئی ایسی جگہ نہ تھی۔ جہاں کوئی معاملہ ہو سکے، چنانچہ جیسا طے پایا تھا، وہ ڈاکٹر خاں صاحب کے ہاں چلے گئے۔ وہ ملٹری ہاسپٹل میں متعین تھا، اور اس کو وہیں دو کمرے ملے ہوئے تھے۔ شہاب نے بمبئی آتے ہی اس کو

فون کر دیا تھا کہ حنیف کے ساتھ رات کو اس کے پاس آئے گا۔ اور معاملہ ساتھ ہو گا، چنانچہ ٹیکسی ملٹری ہسپتال میں پہنچی۔ دلال سو روپیہ لے کر گرانٹ روڈ پر اتر گیا۔

راستے میں بھی شہاب اور حنیف اس عورت کو اچھی طرح نہ دیکھ سکے کوئی خاص باتیں بھی نہ ہوئیں۔ شہاب نے جب اس سے اپنے ٹھیٹ حیدر آبادی لہجے میں پوچھا "آپ کا اسم گرامی" تو اس عورت نے کہا "فو بجا بائی۔"

"فو بجا بائی؟" حنیف سوچتا رہ گیا کہ یہ کیسا نام ہے۔"

ڈاکٹر خان ان کا انتظار کر رہا تھا۔ سب سے پہلے شہاب کمرے میں داخل ہوا دونوں گلے ملے اور خوب ایک دوسرے کو گالیاں دیں۔

ڈاکٹر خان نے جب ایک جوان عورت کو دروازے میں دیکھا تو ایک دم خاموش ہو گیا۔ "آئیے آئیے" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "ڈاکٹر خان — آپ؟" اس نے شہاب کی طرف دیکھا۔

شہاب نے اس عورت کی طرف دیکھا، عورت نے کہا: "فو بجا بائی۔"

ڈاکٹر خان نے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

فو بجا بائی مسکرائی "مجھے بھی خوشی ہوئی۔"

شہاب اور حنیف نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر خان نے دروازہ بند کر دیا اور اپنے دوستوں سے کہا "آپ دوسرے کمرے میں

چلے جایئے۔ مجھے کچھ کام کرنا ہے۔"

شہاب نے جب نوبھا بائی سے کہا: "چلئے" تو اس نے ڈاکٹر خان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں آپ بھی تشریف لایئے۔"

"آپ تشریف لے چلئے میں آتا ہوں۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر خان نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

شہاب اور حنیف نوبھا بائی کو اندر لے گئے۔ تھوڑی دیر گفتگو ہوئی تو ان کو معلوم ہوا کہ اس کی زبان موٹی تھی۔ وہ شین اور سین ادا نہیں کر سکتی تھی اس کے بدلے اس کے منہ سے فے نکلتی تھی۔ اس کا نام اس لحاظ سے شوبھا بائی تھا۔ لیکن کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد ان کو پتہ چلا کہ شوبھا اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ وہ مسلمان تھی جے پور اس کا وطن تھا، جہاں سے وہ چار سال ہوئے۔ بھاگ کر بمبئی چلی آئی تھی۔ اس سے زیادہ اس نے اپنے حالات نہ بتائے۔ معمولی شکل و صورت تھی آنکھیں بڑی نہیں تھیں۔ ناک بھی خوش وضع تھی۔ بالائی ہونٹ کے عین درمیان ایک چھوٹے سے زخم کا نشان تھا۔ جب وہ بات کرتی تو یہ نشان تھوڑا سا پھیل جاتا۔ گلے میں اس نے جڑاؤ نکلس پہنا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔

بہت ہی باتونی عورت تھی۔ بیٹھتے ہی اس نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ حنیف اور شہاب صرف ہوں ہاں کرتے رہے۔ پھر اس نے ان کے

بارے میں ہی پوچھنا شروع کیا کہ وہ کیا کرتے ہیں، کہاں رہتے ہیں، کیا عمر ہے فادی فدا ہیں یا غیر فادی فدہ. حنیف اتنا دبلا کیوں ہے فہاب نے دو مصنوعی دانت کیوں لگوائے ہیں. گرفت خورہ تھا تو اس کا علاج ڈاکٹر خاں سے کیوں نہ کرایا. فرماتا کیوں ہے فعر کیوں نہیں گاتا.

شہاب نے اسے کچھ شعر سنائے. شو بھا نے بڑے زوروں کی داد دی جب شہاب نے یہ شعر سنایا۔ ؎

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

تو شو بھا اچھل پڑی۔" واہ جناب صاحب واہ — بہت اچھا فعر ہے۔

اٹھتی جوانیاں ہیں — واہ وا — !"

اس کے بعد شو بھا نے بے شمار شعر سنائے، بالکل بے جوڑ بے تکے، جن کا سر تھا نہ پیر. شعر سنا کر اس نے شہاب سے کہا،" فہاب صاحب، مزا آیا آپ کو۔"

شہاب نے جواب دیا۔" بہت"

شو بھا نے شرما کر کہا — یہ فعر میرے تھے — مجھے فاعری کا بہت فوق ہے۔"

شہاب اور حنیف دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔ اس کے بعد صرف ایک صحیح شعر شوبھا نے سنایا، کبھی تو میرے درد دل کی خبر لے۔

میرے درد سے آ فنا ہونے والے

یہ شعر حنیف کئی بار سن چکا تھا اور شاید پڑھ بھی چکا تھا۔ مگر شوبھا نے کہا۔ حنیف صاحب یہ شعر بھی میرا ہے۔"

حنیف نے خوب داد دی۔" ماشاء اللہ آپ تو کمال کرتی ہیں۔"

شوبھا چونکی۔ معاف کیجئے گا، میری زبان میں تو کچھ خرابی ہے لیکن آپ نے کیوں ماشاء اللہ کے بدلے ماشاء اللہ کہا۔"

حنیف اور شہاب دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔ شوبھا بھی ہنسنے لگی۔ اتنے میں ڈاکٹر خان آ گیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی شوبھا سے کہا۔" کیوں جناب اتنی ہنسی کس بات پر آ رہی ہے۔"

زیادہ ہنسنے کے باعث شوبھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے رومال سے ان کو پونچھا اور ڈاکٹر خاں سے کہا۔" ایک بات ایسی ہوئی کہ ہم سب ہنس پڑے۔"

شوبھا نے اس سے کہا۔" آیئے بیٹھئے۔" چارپائی کے ایک طرف سرک کر

اس نے ڈاکٹر معان کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

پھر شعر و شاعری ہوگئی، شوبھا نے لمبی لمبی چار بے تکی غزلیں سنائیں سب نے داد دی، شہاب اُکتا گیا۔ وہ معاملہ چاہتا تھا۔ حنیف اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر بھانپ گیا چنانچہ اس نے شہاب سے کہا: "اچھا بھئی میں رخصت چاہتا ہوں۔ انشاءاللہ کل صبح ملاقات ہوگی۔"

وہ یہ کہہ کر کرسی پر سے اٹھا مگر شوبھا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا: "نہیں آپ نہیں جا سکتے۔"

حنیف نے جواب دیا: "میں معذرت چاہتا ہوں۔ بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"اوہ — ! لیکن نہیں، آپ تھوڑی دیر اور ضرور بیٹھیں۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔" شوبھا نے اصرار کیا۔

شہاب نے ایک جمائی لی: "بہت وقت ہو گیا ہے۔"

شوبھا نے مسکرا کر شہاب کی طرف دیکھا: "میں ساری رات آپ کے پاس ہوں۔"

شہاب کا تکدر دور ہو گیا۔

حنیف تھوڑی دیر بیٹھا، پھر رخصت لی اور چلا گیا — دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب شہاب آیا اور رات کی بات سنانے لگا: "عجیب و غریب عورت

تھی یہ فو بھا بائی ——— پیٹ پر بالشت بھر آپریشن کا نشان تھا۔
کہتی تھی کہ وہ ایک لکڑی والے سیٹھ کی داشتہ تھی ،اس نے ایک فلم
کمپنی کھول دی تھی۔ اس کے چیکوں پر دستخط شو بھا ہی کے ہوتے تھے،
موٹر تھی، جواب تک موجود ہے نوکر چاکر تھے۔ لکڑی والا سیٹھ اس سے
بے حد محبت کرتا تھا۔اس کے پیٹ کا اپریشن ہوا تو اس نے ایک ہزار
روپیہ یتیم خانے کو دیا۔"

حنیف نے پوچھا" یہ لکڑی والا سیٹھ اب کہاں ہے۔"

شہاب نے جواب دیا" ——— دوسری دنیا میں ٹال کھولے بیٹھا ہے۔
——— عورت خوب تھی یہ فو بھا بائی ——— میں دوسرے کمرے میں
سو گیا، تو وہ ڈاکٹر خان کے ساتھ لیٹ گئی۔ صبح پانچ بجے خان نے اس
سے کہا کہ اب جاؤ۔ شو بھا نے کہا" اچھا، میں جاتی ہوں، لیکن یہ میرے زیور
تم اپنے پاس رکھ لو۔ میں اکیلی ان کے ساتھ باہر نہیں نکلتی۔"

حنیف نے پوچھا" ڈاکٹر نے زیور رکھ لیے؟"

شہاب نے سر ہلایا،

ہاں ——— پہلے تو اس کا خیال تھا کہ نقلی ہیں۔ مگر دن کی روشنی
میں جب اس نے دیکھا تو اصلی تھے۔"

"اور وہ چلی گئی۔"

"ہاں چلی گئی — یہ کہہ کر وہ کسی روز آ کر اپنے زیور واپس لے جائے گی۔"

"یہ تم نے بڑے اچنبھے کی بات سنائی۔"

"خدا کی قسم حقیقت ہے۔" شہاب نے سگریٹ سلگایا۔ "اسی لئے تو میں نے کہا یہ شوبھا بائی عجیب و غریب عورت ہے۔"

حنیف نے پوچھا — "ویسے کیسی عورت تھی؟"

شہاب جھینپ سا گیا۔ "بھئی مجھے ایسے معاملوں کا کچھ پتہ نہیں — یہ تم خان سے پوچھنا، وہ اکسپرٹ ہے۔"

شام کو دونوں خان سے ملے، زیور اس کے پاس محفوظ تھے۔ شوبھا لینے نہیں آئی تھی۔ خان نے بتایا۔ "میرا خیال ہے شوبھا، کسی دماغی صدمے کا شکار ہے۔"

شہاب نے پوچھا۔ "تمہارا مطلب ہے پاگل ہے۔"

خان نے کہا۔ "نہیں ——— پاگل نہیں ہے لیکن اس کا دماغ یقیناً نورمل نہیں۔ بے حد مخلص عورت ہے۔ ایک لڑکا ہے اس کا جے پور میں — اس کے برابر دو سو روپے ماہوار بھیجتی ہے۔ ہر تیسرے مہینے اس سے ملنے جاتی ہے۔ جے پور پہنچتے ہی برقع اوڑھ لیتی ہے۔ وہاں اسے پردہ کرنا پڑتا ہے۔

حنیف نے کہا، یہ تم نے کیسے سمجھا کہ اس کا دماغ نورمل نہیں۔"

خان نے جواب دیا "بھئی میرا خیال ہے ——— نورمل عورت ہوتی تو اپنے ڈیڑھ ہزار کے زیور ایک اجنبی کے پاس کیوں چھوڑ جاتی ——— اس کے علاوہ اس کو مورفیا کے انجکشن لینے کی عادت ہے۔"

شہاب نے پوچھا "نشہ ہوتا ہے ایک قسم کا؟"

خان نے جواب دیا، "بہت ہی خطرناک قسم کا ـــ شراب سے بھی بدتر!"

"اس کی عادت کیسے پڑی اسے؟" شہاب نے میز پر سے پیپر ویٹ اٹھا کر دوات پر رکھ دیا۔

"اپریشن ہوا تو بگڑ گیا۔ درد شدت کا تھا۔ اس کا احساس کم کرنے کے لئے ڈاکٹر مورفیا کے انجکشن دیتے رہے۔ تقریباً دو مہینے تک ـــ بس عادت ہو گئی ۔"

ڈاکٹر خان نے مورفیا اور اس کے خطرناک اثرات پر ایک لیکچر سا شروع کر دیا۔

ایک ہفتہ ہو گیا۔ شوبھانہ آئی۔ شہاب واپس حیدرآباد چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر خان زیور لے کر حنیف کے پاس آیا کہ چلو دے آئیں ـــ دونوں نے گرانٹ ـــ کے ناکے پر اس دلال کو بہت تلاش کیا جو شہاب

اور حنیف کو شوبھا کے مکان کے پاس لے گیا تھا۔ مگر وہ نہ ملا۔ حنیف کو اتنا معلوم تھا کہ گلی کون سی ہے اور بلڈنگ کون سی ہے۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "ٹھیک ہے ہم پتا لگالیں گے ۔ یہ زیور میں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا، چوری ہو گئے تو کیا کروں گا۔ وہ تو عجیب بے پرواہ عورت ہے۔"

دونوں ٹیکسی میں وہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر خان کو حنیف نے بلڈنگ بتادی اور کہا،

"میں نہیں جاؤں گا بھائی تم تلاش کرو اسے۔"

ڈاکٹر خان اکیلا اس بلڈنگ میں داخل ہوا، ایک دو آدمیوں سے پوچھا۔ مگر شوبھا کا کچھ پتہ نہ چلا، نیچے سے لفٹ اوپر کو آئی تو ہوٹل کا چھوکرا پیالیاں اٹھائے باہر نکلا۔ خان نے اس سے پوچھا۔ تو اس نے بتایا کہ سب سے نچلی منزل کے آخری فلیٹ پر چلے جاؤ — لفٹ کے ذریعے سے خان نیچے پہنچا، آخری فلیٹ کی گھنٹی بجائی، تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑھیا عورت نے دروازہ کھولا، خان نے اس سے پوچھا "شوبھا بائی ہیں؟"

بڑھیا نے جواب دیا۔

"ہاں ہیں"

خان نے کہا۔

"جاؤ، اس سے کہو ڈاکٹر خان آئے ہیں۔"

اندر سے شوبھا کی آواز آئی۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب آئیے۔"

ڈاکٹر خان اندر داخل ہوا، چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ چمکیلے فرنیچر سے بھرا ہوا، فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے، بڑھیا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فوراً ہی شوبھا کی آواز آئی۔ "ڈاکٹر صاحب اندر آجائیے ۔ میں باہر نہیں آسکتی۔"

ڈاکٹر خان دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔

شوبھا چادر اوڑھے لیٹی تھی، خان نے اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔"

شوبھا مسکرائی۔

"کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب، تیل مالش کرا رہی تھی۔"

ڈاکٹر پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے رومال نکالا۔ جس میں زیور بندھے تھے کھول کر اسے پلنگ پر رکھ دیا، "کب تک میں تمہارے ان زیوروں کی حفاظت کرتا رہوں گا، تم ایسی گئیں کہ پھر ادھر کا رُخ تک نہ کیا۔"

شوبھا ہنسی۔

"مجھے بہت کام تھے ـــــ لیکن آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں خود آکے لے جاتی۔" پھر اس نے بڑھیا سے کہا۔ "چاء منگاؤ، ڈاکٹر صاحب کے لئے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔

"نہیں مجھے اب جانا ہے۔"

"کہاں؟"

"ہسپتال"

"ٹیکسی میں آئے ہیں آپ؟"

"ہاں۔"

"باہر کھڑی ہے۔"

ڈاکٹر نے سر کے اشارے سے 'ہاں' کہا۔

"تو آپ چلئے میں آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے زیور تکئے کے نیچے رکھ دیئے اور رومال ڈاکٹر خان کو دے دی۔ ڈاکٹر خان، حنیف کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا۔

"مل گئی؟"

ڈاکٹر مسکرایا۔

"مل گئی۔ آ رہی ہے!"

پندرہ بیس منٹ کے بعد شوبھا نے تیزی سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر خان کے کمرے میں دیر تک فضول قسم کی شعر بازی ہوتی رہی ہجر و وصال اور عشق و محبت کے بے شمار عامیانہ اشعار شوبھا نے سنائے اور انہیں اپنے نام سے منسوب کیا۔

ڈاکٹر خان اور حنیف نے خوب داد دی۔ شوبھا بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی۔

"یعقوب فیٹھ گھنٹوں مجھ سے فعر فنا کرتے تھے۔"

یعقوب فیٹھ وہ لکڑی والا سیٹھ تھا جس نے شوبھا کے لئے ایک فلم کمپنی کھولی تھی۔ ڈاکٹر خان اور حنیف ہنس پڑے۔ شوبھا بھی ہنسنے لگی۔

ڈاکٹر خان اور شوبھا کی دوستی ہو گئی۔ شروع شروع میں تو وہ ہفتے میں دو بار آتی تھی۔ اب قریب قریب ہر روز آنے لگی۔ رات آتی۔ صبح سویرے چلی جاتی۔ شام کو بلا ناغہ مورفیا کا انجکشن لیتی۔

ڈاکٹر انجکشن لگانے سے پہلے اس کے بازو پر بے حس کرنے والی دوا لگا دیتا تھا۔ یہ ٹھنڈی چیز اسے بہت پسند تھی۔

تین مہینے گزرے تو شوبھا جے پور جانے کے لئے تیار ہوئی — موٹر اپنی خان کے حوالے کر دی کہ وہ اس کا دھیان رکھے — ڈاکٹر اسے اسٹیشن پر چھوڑنے گیا ——— دیر تک گاڑی میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ جب گاڑی چلنے لگی۔ تو شوبھا نے ایک دم ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھے کیوں ایک دم ایسا لگا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا،

"کیا ہونے والا ہے۔"

شوبھا کے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔

معلوم نہیں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔"

ڈاکٹر خان نے اسے دم دلاسا دیا۔ گاڑی چل دی دور تک شوبھا کا ہاتھ ہلتا رہا۔

جے پور سے شوبھا کے دو خط آئے۔ جن سے صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ وہ خیریت سے پہنچ گئی ہے۔ جب واپس آئے گی تو اس کے لئے

بہت سے تحفے لائے گی۔ اس کے بعد ایک کارڈ آیا جس میں یہ لکھا تھا۔
"میری اندھیری زندگی میں صرف ایک دیا تھا وہ کل خدا نے بجھا دیا۔
۔ بھلا ہو اس کا!"

حنیف نے یہ الفاظ پڑھے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "بھلا ہو اس کا" میں بے پناہ غم تھا۔

بہت عرصہ گزر گیا شوبھا کا کوئی خط نہ آیا۔ پورا ایک برس بیت گیا۔ ڈاکٹر خان کو اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ شوبھا اپنی موٹر اس کے موٹر کے حوالے کر گئی تھی۔ اس بلڈنگ میں گیا۔ جس کی سب سے نچلی منزل میں وہ رہا کرتی تھی۔ فلیٹ پر کوئی اور ہی قابض تھا۔ ایک دلال قسم کا آدمی۔ ڈاکٹر خان آخر تھک ہار کر خاموش ہو گیا۔ موٹر اس نے ایک گراج میں رکھوا دی۔

ایک دن حنیف گھبرایا ہوا ہسپتال آیا اس کا چہرہ زرد تھا۔ ڈاکٹر خان کو ڈیوٹی سے ہٹا کر وہ ایک طرف لے گیا۔ اور اس سے کہا "میں نے آج شوبھا کو دیکھا۔"

ڈاکٹر نے حنیف کا بازو پکڑ کر ایک دم پوچھا۔ "کہاں؟"

چوپاٹی پر ـــــ میں اسے بالکل نہ پہچانتا کیونکہ وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔"

ڈاکٹر خان کھوکھلی آواز میں بولا،
"ہڈیوں کا ڈھانچہ"

حنیف نے سرد آہ بھری،" شوبھا نہیں تھی، اس کا سایہ تھا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں — بال پریشان اور گرد آلود — یوں چلتی تھی کہ اپنے آپ کو گھسیٹ رہی ہے۔ میرے پاس آئی اور کہا — "مجھے پانچ روپے دو۔ میں نے اس کو نہ پہچانا۔ پوچھا — کیا کرو گی پانچ روپے لے کر — بولی مورفیا کا ٹیکہ لوں گی — ایک دم میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا — اس کے بالائی ہونٹ پر زخم کا نشان موجود تھا — میں چلا — "شوبھا — اس نے تھکی ہوئی ویران آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پوچھا، کون ہو تم — میں نے کہا — حنیف — اس نے جواب دیا، میں کسی حنیف کو نہیں جانتی۔ میں نے تمہارا ذکر کیا۔ کہ تم نے اسے بہت تلاش کیا، بہت ڈھونڈا — یہ سن کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور کہنے لگی۔ اس سے کہنا مت ڈھونڈے مجھے، میری طرف دیکھو۔ میں اتنی مدت سے اپنا کھویا ہوا لال ڈھونڈتی پھر رہی ہوں — یہ ڈھونڈنا بالکل بیکار رہے — کچھ نہیں ملتا — لاؤ پانچ روپے دو مجھے — میں نے اسے پانچ روپے دیئے اور کہا، اپنی موٹر تو لے جاؤ ڈاکٹر خان سے،" وہ قہقہے لگاتی ہوئی چلی گئی۔

خان نے پوچھا "کہاں ؟"

حنیف نے جواب دیا "معلوم نہیں — کسی ڈاکٹر کے پاس گئی ہوگی۔"

ڈاکٹر خان نے بہت تلاش کیا مگر شوبھا کا کچھ پتہ نہ چلا۔

۱۲ر جون ۱۹۵۰ء

ابجی ڈُڈُو

"مجھے مت ستائیے — خدا کی قسم، میں آپ سے کہتی ہوں مجھے مت ستائیے۔"

"تم بہت ظلم کر رہی ہو آجکل!"

"جی ہاں بہت ظلم کر رہی ہوں۔"

"یہ تو جواب نہیں۔"

"میری طرف سے صاف جواب ہے اور یہ میں آپ سے کئی دفعہ کہہ چکی ہوں۔"

"آج میں کچھ نہیں سنوں گا۔"

"مجھے مت ستائیے. خدا کی قسم، میں آپ سے سچ کہتی ہوں، مجھے مت ستائیے میں چلانا شروع کر دوں گی۔"

"آہستہ بولو. بچیاں جاگ پڑیں گی۔"

"آپ تو بچیوں کے ڈھیر لگانا چاہتے ہیں۔"

"تم ہمیشہ مجھے یہی طعنہ دیتی ہو۔"

"آپ کو کچھ خیال تو ہونا چاہیے — میں تنگ آچکی ہوں۔"

"درست ہے — لیکن —"

"لیکن ویکن کچھ نہیں!"

"تمہیں میرا خیال کچھ نہیں — اصل میں اب تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔ آج سے آٹھ برس پہلے جو بات تھی وہ اب نہیں رہی — تمہیں اب میری ذات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔"

"جی ہاں۔"

"وہ کیا دن تھے جب ہماری شادی ہوئی تھی. تمہیں میری ہر بات کا کتنا خیال رہتا تھا، ہم باہم کس قدر شیر و شکر تھے — مگر اب تم کبھی سونے کا بہانہ کر دیتی ہو، کبھی تھکاوٹ کا عذر پیش کر دیتی ہو اور کبھی دونوں کان بند کر لیتی ہو، کبھی سنتی ہی نہیں۔"

"میں کچھ سننے کے لئے تیار نہیں!"

"تم ظلم کی آخری حد تک پہنچ گئی ہو۔"

"مجھے سونے دیجئے!"

"سو جائیے ——— مگر میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہوں گا۔ آپ کی بلا سے۔!"

"آہستہ بولئے۔ ساتھ ہمسائے بھی ہیں۔"

"ہوا کریں۔"

"آپ کو تو کچھ خیال ہی نہیں ——— سنیں گے تو کیا کہیں گے۔"

"کہیں گے کہ اس غریب آدمی کو کیسی کڑی بیوی ملی ہے۔"

"اوہ ہو۔"

"آہستہ بولو۔ دیکھو مجی جاگ پڑی!"

"اللہ اللہ ——— اللہ جی اللہ ——— اللہ اللہ ——— اللہ جی اللہ ——— سو جاؤ بیٹے سو جاؤ ——— اللہ اللہ اللہ جی ——— خدا کی قسم آپ بہت تنگ کرتے ہیں۔ دن بھر کی تھکی ماندی کو سونے تو دیجئے!"

اللہ اللہ ——— اللہ جی اللہ ——— اللہ اللہ ——— اللہ جی اللہ ——— تمہیں ——— اچھی طرح سلانا بھی نہیں آتا۔"

"آپ کو تو آتا ہے نا ——— سارا دن آپ گھر میں رہ کر بھی تو کرتے رہتے ہیں۔"

"بھئی میں سارا دن گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں — جب فرصت ملتی ہے آجاتا ہوں اور تمہارا ہاتھ بٹا دیتا ہوں۔"

"میرا ہاتھ بٹانے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں، آپ مہربانی کر کے گھر سے باہر اپنے دوستوں ہی کے ساتھ گلچھڑے اڑایا کریں۔"

"گل چھڑے؟"

"میں زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتی"

"اچھا دیکھو، میری ایک بات کا جواب دو۔"

"خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کیجئے۔"

"کمال ہے میں کہاں جاؤں۔"

"جہاں آپ کے سینگ سمائیں چلے جایئے۔"

"لو اب ہمارے سینگ بھی ہو گئے۔"

"آپ چپ نہیں کریں گے۔"

"نہیں —— میں آج بولتا ہی رہوں گا، خود سوؤں گا نہ تمہیں سونے دوں گا۔"

"سچ کہتی ہوں، میں پاگل ہو جاؤں گی —— لوگو یہ کیسا آدمی

ہے ـــــ کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے ـــــ بس ہر وقت ۔ ہر وقت ہر وقت . . . . "

"تم ضرور تمام بچیوں کو جگا کر رہو گی ۔"

"نہ پیدا کی ہوتیں اتنی !"

"پیدا کرنے والا میں تو نہیں ہوں ـــــ یہ تو اللہ کی دین ہے ـــــ اللہ اللہ ـــــ اللہ جی اللہ ، اللہ ـــــ اللہ جی اللہ ۔"

"بچی کو اب میں نے جگایا تھا ؟"

"مجھے افسوس ہے !"

"افسوس ہے کہہ دیا ـــــ چلو چھٹی ہوئی ـــــ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلائے چلے جا رہے ہیں ۔ ہمسائیگی کا کچھ خیال نہیں لوگ کیا کہیں گے اس کی کوئی پرواہ ہی نہیں ۔ خدا کی قسم میں عنقریب ہی دیوانی ہو جاؤں گی ۔"

"دیوانے ہوں تمہارے دشمن"

"میری جان کے دشمن تو آپ ہیں ۔"

"تو خدا مجھے دیوانہ کرے ۔"

"وہ تو آپ ہیں !"

"میں دیوانہ ہوں، مگر تمہارا"

"اب جو نچلے نہ بگھار یئے۔"

"تم تو نہ یوں مانتی ہو نہ وہ"

"میں سونا چاہتی ہوں۔"

"سو جاؤ، میں پڑا بکواس کرتا رہوں گا۔"

"یہ بکواس کیا اشد ضروری ہے۔"

"ہے تو سہی — ذرا ادھر دیکھو —"

"میں کہتی ہوں مجھے تنگ نہ کیجئے، میں رو دوں گی۔"

"تمہارے دل میں اتنی نفرت کیوں پیدا ہو گئی میری ساری زندگی تمہارے لئے ہے، سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو تو بتا دو۔"

"آپ کی تین خطائیں یہ سامنے پلنگ پر پڑی ہیں۔"

"یہ تمہارے کوسنے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔"

"آپ کی ہٹ کب ختم ہو گی؟"

"لو بابا میں تم سے کچھ نہیں کہتا، سو جاؤ — میں نیچے چلا جاتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"جہنم میں"

"یہ کیا پاگل پن ہے ——— نیچے اتنے مچھر ہیں ——— پنکھا بھی نہیں ——— سچ کہتی ہوں، آپ بالکل پاگل ہیں ——— میں نہیں جانے دوں گی آپ کو۔"

"میں یہاں کیا کروں گا ——— مچھر ہیں پنکھا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے میں نے زندگی کے بڑے دن بھی گزارے ہیں۔ تن آسان نہیں ہوں۔ سو جاؤں گا صوفے پر۔"

"سارا وقت جاگتے رہیں گے۔"

"تمہاری بلا سے"

"میں نہیں جانے دوں گی آپ کو ——— بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔"

"میں مر نہیں جاؤں گا۔ مجھے جانے دو۔"

"کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں! ۔ خبردار جو آپ گئے!"

"مجھے یہاں نیند نہیں آئے گی۔"

"نہ آئے۔"

"یہ عجب منطق ہے ——— میں کوئی لڑ جھگڑ کر تو نہیں جا رہا۔"

" لڑائی جھگڑا کیا ابھی باقی ہے ـــــــ خدا کی قسم آپ کبھی کبھی بالکل بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں ـــ اب یہ خبط سر میں سمایا ہے کہ میں نیچے گرمی اور مچھروں میں جاکر سوؤں گا ـــــــ کوئی اور ہوتی تو پاگل ہو جاتی ."

" تمہیں میرا بڑا خیال ہے ."

" اچھا بابا نہیں ہے ـ آپ چاہتے کیا ہیں ؟"

" اب سیدھے راستے پر آئی ہو ـ"

" چلئے ہٹئے ـــــــ میں کوئی راستہ نہیں جانتی ، منہ دھو کے رکھئے اپنا ـ"

" منہ صبح دھویا جاتا ہے ـــ لو اب من جاؤ ـ"

" توبہ !"

" ساڑھی پر وہ باڈر لگ کر آ گیا ؟"

" نہیں !"

" عجیب الو کا پٹھا ہے درزی ـــــــ کہہ رہا تھا آج ضرور پہنچا دے گا ـ"

" لے کر آیا تھا ، مگر میں نے واپس کر دی ـــ"

" کیوں ؟"

"ایک دو جگہ بھول گئے۔"

"اوہ ـــ اچھا، میں نے کہا، کل "برسات" دیکھنے چلیں گے۔" میں نے پاس کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"کتنے آدمیوں کا؟"

"دو کا ـــ کیوں؟"

"باجی بھی جانا چاہتی تھیں۔"

"ہٹاؤ باجی کو پہلے ہم دیکھیں گے پھر اس کو دکھا دیں گے ـــ پہلے ہفتے میں پاس بڑی مشکل سے ملتے ہیں ـــ چاندنی رات میں تمہارا بدن کتنا چمک رہا ہے۔"

"مجھے تو اس چاندنی سے نفرت ہے کم بخت آنکھوں میں گھستی ہے۔ سونے نہیں دیتی۔"

"تمہیں تو بس ہر وقت سونے ہی کی پڑی رہتی ہے۔"

"آپ کو بچیوں کی دیکھ بھال کرنا پڑے تو پھر پتا چلے، آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔ ایک کے کپڑے بدلو، تو دوسری کے میلے ہو جاتے ہیں، ایک کو سلاؤ، دوسری جاگ پڑتی ہے، تیسری نعمت خانے کی غارتگری میں مصروف ہوتی ہے۔"

" دو نوکر گھر میں موجود ہیں۔"

" نوکر کچھ نہیں کرتے۔"

" تو انہیں نکال باہر کرو۔"

" آہستہ بولیے ۔ دیکھیے چھوٹی کیسے چونکی ہے۔"

" معاف کر دینا۔ ذرا ہاتھ سے تھپکا دو!"

" منجھلی بھی تڑپ رہی ہے۔"

" پیشاب کرا دیا تھا اسے۔"

" جی ہاں!"

" پھر کیا وجہ ہے؟"

" گرمی آج کچھ زیادہ ہے ——— آپ پرے ہٹ جایئے۔"

" نہیں نہیں۔"

" آخر ہار مجھے ہی ماننی پڑتی ہے۔"

" تمہاری ہار ہار نہیں جیت ہوتی ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے، مجھے تم سے کتنی محبت ہے!"

"اپنی محبت آپ اسی وقت جتایا کرتے ہیں۔"

"لو بھئی، اور کیا سر بازار تم سے محبت کیا کروں — ادھر دیکھو میری طرف۔"

"آپ اپنی کر کے رہیں گے!"

"میری جان جو ہوئیں تم۔"

"میں نے کہا ہٹیئے۔"

"کیا ہوا؟"

"دیکھتے نہیں بڑی اٹھ کر بیٹھی ہوئی ہے۔"

"اوہ!"

"سنا نہیں آپ نے؟"

"کیا؟"

"کہہ رہی ہے ابجی ڈڈو!"

"ہاں ہاں سنا ہے — دے دے دودھ۔"

"میں نیچے بھول آئی ہوں۔"

"نیچے؟"

"ہاں نعمت خانے میں — جائیے لے آئیے۔"

"لے آؤں نیچے سے؟"

"جلدی جائیے ورنہ رونا شروع کر دے گی"

"جاتا ہوں !"

"میں نے کہا، سنئے — آگ جلا کر ذرا کنکنا کر لیجئے گا دودھ۔"

"اچھا، اچھا — سن لیا ہے !"

۱۳ / جون ۱۹۵۰ء

محمد سعید کمال خوشنویس